وقت
کی
اہمیت
علامہ یوسف القرضاوی

علّامہ یوُسف القرضاوی

مترجم

مولانا عبدالحلیم فلاحی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۳۹۹

نام کتاب : وقت کی اہمیت

مصنف : علامہ یوسف القرضاوی

مترجم : مولانا عبدالحلیم فلاحی

صفحات : ۱۲۰

اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۲ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : -/۵۰ روپے

ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۲۵

فون: ۲۶۹۷۱۶۵۲، ۲۶۹۵۴۳۴۱ فیکس: ۲۶۹۴۷۸۵۸

E-mail: mmipublishers@gmail.com
Website: www.mmipublishers.net

مطبوعہ : ایچ۔ایس آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی-۲

WAQT KI AHAMMIYAT (Urdu)
By: Allama Yusuf Al-Qarzawi
Translated by:
Maulana Abdul Haleem Falahi
Pages: 120
Price: Rs.50.00

ترتیب

۞ ۞ ۞

عرضِ مترجم

ڈاکٹر یوسف القرضاوی صاحب کی کتاب "الوقت فی حیاۃ المسلم"، کا اُردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ وقت کا موضوع اتنا اہم ہے کہ اس کی اہمیت سے نہ تو قدیم زمانے میں کسی نے انکار کیا ہے اور نہ آج کے اس جدید دور میں کوئی اس کا انکار کرسکتا ہے۔ بلکہ جدید دور میں تو اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔

فاضل مصنّف نے اِس کتاب میں وقت کی اہمیت کے موضوع پر نہایت عمدہ اور مدلّل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے موصوف نے قرآن و سنّت میں وقت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلامی شعائر و آداب کس طرح کسی مسلمان کے اوقات کو منضبط کرتے ہیں اور اُسے پابندئ اوقات کا عادی بناتے ہیں۔ مگر اسلام کے اس تربیتی نظام سے دراصل وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اُن شعائر و آداب کی پابندی کریں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصّے میں ڈاکٹر صاحب نے ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں سے متعلق پائے جانے والے تصورات و نظریات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ اور اُن کا آپریشن کرکے ان کے نقائص و معائب کو بھرپور طریقے سے واضح کیا ہے۔

پھر آگے چل کر ان تینوں زمانوں سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی نہایت عمدگی سے وضاحت کی ہے، اور اسے گوناگوں دلائل سے مدلل کیا ہے، اور اس بات پر زور دیا ہے کہ وقت سے متعلق افراط و تفریط کے درمیان اسلام ہی دراصل وقت کا اعتدال پسندانہ تصور پیش کرتا ہے۔

کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے اس کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اردو خواں حلقہ بھی اس قیمتی کتاب سے استفادہ کرسکے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی عالمِ اسلام کی ایک مایۂ ناز شخصیت ہیں موصوف دینی، دعوتی اور تحریکی حلقوں میں ایک اسلامی مفکر اور داعی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ چوں کہ ان کی اکثر کتابیں اردو میں بھی منتقل ہوچکی ہیں اس وجہ سے اردو خواں حلقہ بھی ان کی شخصیت سے کافی حد تک آشنا ہے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام کرم فرماؤں کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کام میں میری کسی طرح بھی مدد یا رہنمائی فرمائی ہے۔ خاص طور پر برادرِ محترم محمد جاوید اقبال صاحب مینجر مرکزی مکتبہ اسلامی کا از حد ممنون ہوں جن کی تحریض پر میں نے اس کام کی ہمت کی۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اس کو مکمل کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ اور قارئین سے گزارش ہے کہ اگر یہ کتاب آپ کے لیے کچھ بھی مفید ثابت ہو تو مصنف، مترجم اور ناشر تینوں کو اپنی دعائے خیر میں یاد رکھیں۔

واللہ ھو الموفق۔

خاکسار

عبد الحلیم

۶-۱-۱۹۹۳ء

مقدّمہ

میں "وقت" اور مسلمان کی زندگی میں اس کی قدر و قیمت کے عنوان سے اخبارات میں لکھ رہا تھا کہ دورانِ مطالعہ قرآن وسنّت میں وقت سے متعلق حد درجہ اہتمام نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اُن صفحات کو میں کتابی شکل دے دوں۔

دورانِ مطالعہ میں نے دیکھا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنے اوقات کے سلسلے میں اتنے حریص تھے کہ اُن کی یہ حرص اُن کے بعد کے لوگوں کی درہم و دینار کی حرص سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اسی حرص کے سبب اُن کے لیے علم نافع، عمل صالح، جہاد اور فتحِ مبین کا حصول ممکن ہوا، اور اسی کے نتیجے میں وہ تہذیب وجود میں آئی جس کی جڑیں انتہائی گہری ہیں اور جس کی شاخیں ہر چہار جانب پھیلی ہوئی ہیں۔

پھر میں آج کی دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کہ وہ کس طرح سے اپنے اوقات کو ضائع کر رہے ہیں، اور اپنی عمریں لُٹا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اس سلسلے میں بے وقوفی سے گزر کر مدہوشی کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج وہ قافلۂ انسانیت کے پچھلے حصّے میں دھکیل دیے گئے ہیں، حالاں کہ ایک دن وہ بھی تھا کہ اُسی قافلے کی زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اور موجودہ دور میں اُنھوں نے

نہ اہل دنیا کی طرح اپنی دنیا بسانے کا کام کیا، اور نہ دین داروں کی طرح اپنی آخرت بنانے کا، بلکہ دُنیا و آخرت دونوں برباد کر لی، اور نتیجتہً دونوں جہان کی نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

اگر مسلمان سوجھ بوجھ سے کام لیتے تو وہ دُنیا کے لیے اس طرح کام کرتے، جیسے کہ انھیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے، اور آخرت کے لیے اس طرح کام کرتے گویا کہ کل مرنا ہے۔ اور اِس جامع قرآنی دُعا کو اپنا شعار بناتے:

"رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (البقرہ: ۲۰۱)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔

اگر انھوں نے عقل و دانش سے کام لیا تو بہت ممکن ہے کہ زمانہ انھیں سکھا دے، اور شب و روز کی آمد و شد انھیں ہشیار کر دے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ط وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ﷺ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا

مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (آل عمران : ۱۹۰ - ۱۹۴)

ترجمہ: زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں، "پروردگار، یہ سب کچھ تونے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تُو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تُونے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلّت ورسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک ہم نے ایک پکارنے والے کو سُنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اُس کی دعوت قبول کرلی، پس اے ہمارے آقا، جو قصور ہم سے ہوتے ہیں اُن سے درگزر فرما، جو بُرائیاں ہم میں ہیں اُنہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا، جو وعدے تونے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

قرآن وسنّت میں وقت کی اہمیّت

قرآن وسنت میں وقت کی اہمیّت مختلف پہلوؤں سے بتائی گئی ہے۔ قرآن اس کی اہمیّت کا ذکر کرتے ہوئے اسے عطیۂ خداوندی قرار دیتا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ج وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ٥ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط

(ابراہیم: ۳۳-۳۴)

ترجمہ: اور اللہ ہی نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخّر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخّر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکتے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ٥ (الفرقان: ۶۲)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اُس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے۔

یعنی رات کو بنایا کہ وہ دن کے بعد آئے اور دن کو بنایا کہ وہ رات کے بعد آئے، تو جس کا کوئی کام ان دونوں میں سے کسی ایک میں کرنے سے رہ گیا ہو تو وہ اس کی تلافی دوسرے میں کرنے کی کوشش کرے۔

وقت کی اہمیت بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد مکّی سُورتوں کے آغاز میں اس کی قسمیں کھائی ہیں۔ مثلاً وَاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ، وَالفَجْرِ، وَالضُّحیٰ، وَالعَصْرِ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی، وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی۔

ترجمہ: قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے، اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو۔

وَالْفَجْرِ، وَلَیَالٍ عَشْرٍ۔

ترجمہ: قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی۔

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔

ترجمہ: قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔

وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔

ترجمہ: زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔

اور یہ بات مفسّرین اور اہل علم کے نزدیک معروف ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو صرف اس لیے کہ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرے، اور اس کے عظیم فائدوں اور اثرات سے آگاہ کرے۔

قرآن کی طرح سنّت نبوی نے بھی وقت کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت پر زور دیا ہے، اور قیامت کے دن خدا کے حضور انسان کو وقت کے متعلق

جواب دہ قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ حساب کے دن جو بنیادی سوالات ہر انسان سے پوچھے جائیں گے ان میں سے دو کا تعلق وقت سے ہے۔ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ، عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اِكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ۔ (ترمذی، ج ۲ ص ۶۴)

ترجمہ: قیامت کے دن کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے ہل نہ سکے گا تا آنکہ پانچ سوالوں کا جواب نہ دے لے: عمر کہاں گزاری، جوانی کس کام میں کھپائی، مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اور اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔

انسان سے اس کی عُمر کے بارے میں عمومی طور پر اور جوانی کے بارے میں خصوصی طور پر سوال کیا جائے گا۔ اگرچہ جوانی بھی عمر ہی کا ایک حصّہ ہے، لیکن اس کی ایک نمایاں حیثیت ہے ــــ اس لیے کہ یہ عزم و حوصلہ اور کچھ کر گزُرنے کی عُمر ہوتی ہے، اور یہ دو کمزوریوں، بچپن اور بڑھاپے کے درمیان طاقت و قوت کا مرحلہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ط (الروم: ۵۴)

ترجمہ: اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اُس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی، پھر اُس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔

اسلامی شعائر وآداب وقت کی قدر وقیمت پر زور دیتے ہیں

اِسلامی فرائض وآداب وقت کی قدر وقیمت اور اس کی اہمیت کو اپنے ہر مرحلے میں بلکہ ہر جُزو میں بھرپور طریقے سے واضح کرتے ہیں۔ اور انسان کے اندر کائنات کی گردش اور شب و روز کی آمدوشد کے ساتھ وقت کی اہمیت کا احساس اور شعور بیدار کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب رات رخصت ہوتی ہے، اور فجر کے چہرے سے اپنا نقاب اُتارتی ہے تو اللہ کی طرف بُلانے والا اُٹھتا ہے اور اذان کی گُونج سے آفاق کو بھر دیتا ہے، اور زمانے کے کانوں میں رس گھولتا ہے، غافلوں کو ہوشیار کرتا ہے اور سونے والوں کو جگاتا ہے کہ وہ اُٹھیں اور پاکیزگیٔ صبح سے بہرہ ور ہوں۔ "حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ"۔ آؤ نماز کی طرف، "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ"۔ آؤ بھلائی کی طرف۔ "اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ"۔ نماز نیند سے بہتر ہے ـــــ لہٰذا جو لوگ پاکیزہ اور باوضو ہوتے ہیں، جن کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر اور دل شکرگزاریوں سے لبریز ہوتے ہیں ـــــ وہ اس کا جواب دیتے ہیں، "صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ"۔ تم نے سچ کہا اور تم نے نیک کام کیا۔ اور جیسے ہی تم جلدی سے نماز کے لیے اُٹھتے ہو شیطان کی ساری گرہیں کھُل جاتی ہیں۔

جب دوپہر کا وقت ہوجاتا ہے، سُورج ڈھلنے لگتا ہے، اور لوگ دنیوی مشاغل میں منہمک ہوجاتے ہیں تو اس وقت منادی اللہ کی کبریائی، بزرگی اور رسالتِ محمدی کے اقرار کے ساتھ نماز اور کامیابی کی طرف لوگوں کو بُلاتا ہے، اور یہ پُکار سنتے ہی لوگ اپنے کاروبار اور زندگی کی مصروفیات سے باہر نکل آتے

ہیں، تاکہ چند منٹ کے لیے اپنے خالق و رازق کے حضور کھڑے ہوں اور مال و دولت کے حصول کی سعی و جہد سے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے یکسو کرلیں۔ یہ کیفیت بالعموم ظہر کے وقت ہوتی ہے۔

جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جاتا ہے اور سورج کسی قدر مائل بغروب ہونے لگتا ہے تو مؤذن تیسری بار نمازِ عصر کے لیے پکارتا ہے۔ جب سورج کی ٹکیہ روپوش ہوجاتی ہے اور اس کا چہرہ افق سے غائب ہوجاتا ہے تو چوتھی بار مؤذن نمازِ مغرب کے لیے بلاتا ہے جو دن کی آخری اور رات کی پہلی نماز ہے۔

جب شفق غائب ہوجاتی ہے تو پھر ایک بار عشاء کی نماز کے لیے ربانی آواز بلند ہوتی ہے اور یہ اذان مسلمان کے دن کے خاتمے کی نماز کے لیے ہوتی ہے اس طرح مسلمان اپنے دن کا آغاز بھی نماز سے کرتا ہے اور اختتام بھی۔

ہفتے میں ایک دن جمعہ کا آتا ہے اس دن منادی ہفتے واری اجتماعی نماز (جمعہ کی نماز) کے لیے ایک نئی آواز لگاتا ہے اس کی اپنی ایک خاص شکل ہے اور کچھ مخصوص شرائط ہیں۔

ان فرض نمازوں کے علاوہ تہجّد کی نماز ہے۔ یہ نماز اللہ کے خاص بندے پڑھتے ہیں۔ اِشراق، چاشت اور بعض دوسری بہت سی نفل نمازیں بھی شب و روز کے مختلف اوقات میں ادا کی جاتی ہیں۔

اور ہر مہینے کے آغاز میں جب نیا چاند طلوع ہوتا ہے تو مسلمان اس کا استقبال اپنے رب سے اس دعا کے ساتھ کرتے ہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِیْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ۔

ترجمہ: اللہ سب سے بڑا ہے، اے اللہ اس چاند کو ہمارے اوپر

امن وایمان اور سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال، اور ہمیں اُن کاموں کی توفیق دے جو تجھے پسند ہیں اور جن سے تُو خوش ہوتا ہے۔ میرا اور تمہارا رب اللہ ہے۔

ہر سال رمضان کے مہینے میں جب جنّت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنّم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، اور شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں تو آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے: اے خیر کے چاہنے والو! آگے بڑھو، اور اے شر کے چاہنے والو دُور رہو۔

اس مبارک مہینے میں گنہگار توبہ کرتا ہے اور رُوگردانی کرنے والا اپنے رب کی طرف رجوع ہوتا ہے، اور غافل اپنی غفلت سے باز آتا ہے اور بہت سے وہ لوگ جو اللہ سے دُور ہوتے ہیں اس کی جناب میں آجاتے ہیں، اور روزہ و قیامُ اللَّیلِ کے ذریعے اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی کے طالب ہوتے ہیں، جیسا کہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ داروں سے وعدہ فرمایا ہے:

"مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّ إِحْتِسَاباً غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّ احْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ."

ترجمہ: جس نے ایمان اور اجر و ثواب کی نیت سے روزہ رکھا، اس کے پچھلے گناہ بخش دیے گئے۔ اور جس نے ایمان اور اجر و ثواب کی خاطر قیام اللیل کیا اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دیے گئے۔

اور رمضان کے اس رُوحانی سفر کے فوراً بعد ایک دُوسرا سفر شروع ہوتا ہے، جو بیک وقت مادّی اور روحانی دونوں ہے۔ یہ سفر حج کا ہے

جس کے مہینے رمضان ختم ہوتے ہی شروع ہوجاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ ج فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۔ (البقرہ : ۱۹۷)

ترجمہ: حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں ۔ جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے ، اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل ، کوئی بدعملی ، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو ، اور جو نیک کام تم کروگے ، وہ اللہ کے علم میں ہوگا ۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے ۔ پس اے ہوشمندو ! نافرمانی سے پرہیز کرو ۔

بعض سلف صالحین کے بارے میں آتا ہے کہ وہ پانچ وقت کی نماز کو " روزانہ کی میزان " ، جمعہ کی نماز کو " ہفتے کی میزان " ، رمضان کے روزوں کو " سال کی میزان " اور حج کو " عُمر کی میزان " قرار دیتے تھے ۔ اس لیے ان کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ ان کا دن صحیح وسالم گزر جائے ۔ اور جب دن گزر جاتا تو انہیں ہفتے کی سلامتی کی فکر لاحق ہوتی ، اور جب ہفتہ گزر جاتا تو سال کی فکر دامن گیر ہوتی ، پھر آخر میں عُمر کی سلامتی کی فکر ہوتی ۔

اسی طرح ان عبادتوں کے پہلو بہ پہلو فریضۂ زکوٰۃ بھی ہے جو بالعموم سال گزرنے پر اور ہر کٹائی اور پھل توڑنے کے وقت واجب ہوتا ہے :

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔ (الانعام: ۱۴۲)

ترجمہ: اور اللہ کا حق ادا کرو جب اس کی فصل کاٹو۔

اِس طرح مسلمان وقت کی رفتار سے ہوشیار رہتا ہے اور اس کی گردش پر نگاہ رکھے رہتا ہے تاکہ فریضۂ زکوٰۃ کو ٹھیک وقت پر ادا کرسکے۔

وقت کی خصوصیات

وقت کی کچھ خصوصیات ہیں جن سے واقفیت ہمارے لیے ضروری ہے تاکہ انھیں کی روشنی میں ہم وقت کا استعمال کرسکیں۔

۱۔ تیز رفتاری

وقت کی سب سے بڑی خصوصیت تیز رفتاری ہے۔ یہ بادلوں کی طرح گزرتا ہے اور ہوا کی مانند اُڑتا ہے ــــ خواہ وہ مسرت و شادمانی کے لمحات ہوں یا غم و حزن کے اوقات ــــ گرچہ خوشی کے ایّام زیادہ تیزی سے گزرتے ہیں، اور غم کے آہستہ آہستہ ــــ لیکن حقیقت کے اعتبار سے ایسا نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ صرف متعلّقہ شخص کا احساس ہوتا ہے۔

انسان کی عُمر اس دنیا میں جتنی بھی طویل ہوجائے وہ بہر حال تھوڑی ہے۔ اِس لیے کہ انجام کار اُسے مرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ رحم کرے اس شاعر پر جس نے کہا:

وَاِذَا كَانَ اٰخِرُ الْعُمْرِ مَوْتًا
فَسَوَاءٌ قَصِيْرُهٗ وَالطَّوِيْلُ!

ترجمہ: اور جب عمرِ انسانی کا انجام موت ہے تو اس کا مختصر یا طویل ہونا برابر ہے۔

موت کے وقت ہر انسان کو اپنی زندگی کے ماہ و سال انتہائی مختصر معلوم ہوتے ہیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لمحات تھے جو برق رفتاری سے گزر گئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب رُوح قبض کرنے کے لیے موت کا فرشتہ آیا تو اس نے آپؑ سے پوچھا کہ دنیا کو آپ نے کیسا پایا؟ آپ نے فرمایا: اُس گھر کی طرح جس کے دو دروازے ہوں، میں ایک دروازے سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل آیا۔

حالاں کہ نوح علیہ السلام ایک ہزار سال سے زیادہ زندہ رہے۔

یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، مگر اس سے اِس ثابت شدہ حقیقت کی بھرپور عکّاسی ہوتی ہے کہ موت کے وقت عمریں مختصر معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح قیامت کے دن انسان کو اس کے گزرے ہوئے اوقات تھوڑے دکھائے جائیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا۔

(النازعات: ۴۶)

ترجمہ: جس روز یہ لوگ قیامت کو دیکھ لیں گے تو انھیں یُوں محسوس ہوگا کہ یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں۔

اور ایک دُوسری آیت میں ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۔ (یونس : ۴۵)

ترجمہ: اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو انھیں یوں محسوس ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں، گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے۔ فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہِ راست پر نہ تھے۔

۲۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ وقت کی دُوسری بڑی خصوصیت ہے۔ انسان کی زندگی کا جو دن، جو وقت اور جو لمحہ گزر جاتا ہے، وہ دوبارہ واپس نہیں آتا ہے۔ اور نہ اس کا کوئی بدل ہی ممکن ہے۔

حسن بصریؒ نے انتہائی مؤثر انداز میں اس کی تعبیر اس طرح کی ہے:

"روزانہ طلوعِ فجر کے وقت دن پکارتا ہے: اے آدم کے بیٹو! میں ایک نئی مخلوق ہوں اور تمھارے عمل پر گواہ ہوں، تم مجھ سے خوب فائدہ اُٹھالو، اِس لیے کہ میں جانے کے بعد قیامت تک نہیں لوٹوں گا۔"[1]

اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شعراء و ادباء بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد دوبارہ ایامِ شباب کے لوٹنے کی تمنّا کرتے ہیں، ایک شاعر کہتا ہے ؎

أَلَا لَيْتَ الشَّبَابَ يَعُوْدُ يَوْمًا
فَأُخْبِرَهٗ بِمَا فَعَلَ الْمَشِيْبُ!

ترجمہ: اے کاش! جوانی کسی دن لوٹ آتی تو میں اسے بتاتا کہ بڑھاپے

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث ہے۔ حالاں کہ یہ حضرت حسن بصریؒ کا ایک قول ہے۔

نے کیا ظلم ڈھایا ہے۔

ایک دوسرا شاعر عمر کے گزرنے اور اس کے روز و شب کے جانے اور دوبارہ نہ لوٹنے کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے ؎

وَمَا الْمَرْءُ اِلَّا رَاكِبٌ ظَهْرَ عُمْرِهٖ
عَلٰى سَفَرٍ يُفْنِيْهِ بِالْيَوْمِ وَالشَّهْرِ
يَبِيْتُ وَيُضْحِىْ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ
بَعِيْدًا عَنِ الدُّنْيَا قَرِيْبًا اِلَى الْقَبْرِ

ترجمہ: آدمی اپنی عُمر کی پُشت پر سوار ہو کر ایک ایسے سفر پر رواں دواں ہے جو اسے دن اور مہینے کے ذریعے فنا کے گھاٹ اُتار رہا ہے، وہ روزانہ صبح و شام اس حال میں گزر رہا ہے کہ دُنیا سے دُور ہو رہا ہے اور قبر سے قریب۔

وقت انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے

چونکہ وقت برق رفتار ہوتا ہے، اور گزرا ہوا وقت پھر کبھی واپس نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی بدل ہوتا ہے ــــ اس لیے یہ انسان کی سب سے نفیس اور قیمتی متاع ہے۔ اور اس کی نفاست اور قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر عمل اور نتیجے کے لیے وقت درکار ہے بلکہ فی الواقع انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت میں انسان کا حقیقی سرمایہ وقت ہی ہے۔

وقت صرف سونا ہی نہیں ہے، جیسا کہ مثل مشہور ہے، بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ سونا، چاندی، ہیرے اور جواہر ہر چیز سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ امام حسن البناء شہیدؒ کے بقول: وقت ہی زندگی ہے! اور حقیقت بھی یہی

ہے کہ انسان کی زندگی اس وقت سے عبارت ہے جسے وہ پیدائش کی پہلی گھڑی سے لے کر آخری سانس تک گزارتا ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: اے آدم کے بیٹے! تو مجموعۂ ایّام ہے، جب ایک دن گزر گیا تو گویا تیری زندگی کا کوئی حصّہ گزر گیا۔

اس سلسلے میں قرآن دو موقعوں پر انسان کی حسرت اور ندامت کا ذکر کرتا ہے، جب وہ اپنے ضیاعِ وقت پر پچھتائے گا اور اس وقت کا پچھتانا کام نہ آئے گا۔

پہلا موقع: موت کے وقت، جب انسان دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف روانہ ہوتا ہے، اس وقت تمنّا کرتا ہے کہ کاش تھوڑی سی مہلت دے دی جاتی، اور تھوڑی مدّت کے لیے موت ٹال دی جاتی تو میں اپنی بگڑی بنا لیتا، اور تلافئ مافات کر لیتا۔

ایسے لوگوں کا ذکر قرآن نے ان آیتوں میں کیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ، وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ: رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

(المنافقون ۹-۱۰)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا

ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا
وقت آجائے اور اس وقت وہ کہے کہ "اے میرے رب، کیوں
نہ تُو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور
صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔"

اِس فضول تمنّا کا قطعی جواب یہ ہے:

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ط وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ۔ (المنافقون: ۱۱)

ترجمہ: اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا جب اس کی مہلتِ عمل
پُوری ہونے کا وقت آجاتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے
باخبر ہے۔

دُوسرا موقع: آخرت میں جب سب کا پُورا پُورا حساب چُکا دیا جائے گا، ہر
آدمی کو اپنی کمائی کا بھرپور بدلا مل جائے گا، جنّت والے جنّت میں داخل ہو جائیں
گے اور دوزخی دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے، اُس وقت اہلِ جہنّم تمنا کریں گے
کہ کاش! ایک بار پھر دنیا میں بھیج دیے جاتے تو نئے سرے سے عملِ صالح کا آغاز
کرتے ــــ مگر افسوس کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوگی، اِس لیے کہ عمل کا زمانہ ختم
ہوگیا اور جزا و سزا کا وقت آگیا۔ ایسے لوگوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یُوں کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ج لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا
وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ط كَذٰلِكَ نَجْزِىْ كُلَّ
كَفُوْرٍ ○ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ج رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ ج اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ
مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ط فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ

مِنْ نَّصِيْرٍ۔ (فاطر: ۳۵ - ۳۶)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اُن کے لیے جہنّم کی آگ ہے ۔ نہ اُن کا قصّہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ اُن کے لیے جہنّم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی ۔ اس طرح ہم بدلا دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو ۔ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ" اے ہمارے رب ، ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں اُن اعمال سے مختلف جو پہلے ہم کرتے رہے تھے ۔" (اُنھیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا ؟ اور تمہارے پاس متنبّہ کرنے والا بھی آچکا تھا ، اب مزا چکھو ۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے ۔"

اور اس جھنجھوڑ دینے والے سوال سے اُن کی ساری آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی :

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيْرُ۔ (فاطر: ۳۶)

ترجمہ: کیا ہم نے تم کو اتنی عُمر نہیں دی تھی کہ جس میں اگر کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا اور تمہارے پاس خبردار کرنے والا بھی آچکا تھا ۔

اُن لوگوں سے اس سوال کا کوئی جواب نہ بن پڑے گا ۔

اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اُسی کے مطابق اُسے عمر اور وسائل بھی عطا کرتا ہے اور تذکیر بھی کرتا ہے ۔ اس کے باوجود بھی کوئی اس کام میں غفلت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ سخت گرفت کرتا ہے اور کسی قسم کا عذر اس

کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جس نے ساٹھ سال عمر پائی ہو۔ اس لیے کہ عمر کا اتنا بڑا حصّہ غافل کو ہوشیار ہونے، بھٹکے ہوئے خُدا کی طرف پلٹنے اور گنہگار کو توبہ کی طرف متوجّہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ جس کو ساٹھ سال مہلت دیتا ہے، اس کے عذر قبول نہیں کرتا۔" (رواہ البخاری)

وقت کے تئیں مسلمان کی ذمّہ داری

جب وقت کی اتنی زیادہ اہمیت ہے، یہاں تک کہ وقت ہی کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے، تو ایک مسلمان پر وقت کے اعتبار سے بڑی ذمّہ داریاں عاید ہوتی ہیں، اِس لیے اسے چاہیے کہ اُن ذمّہ داریوں کو سمجھے اور ہمیشہ اُنھیں اپنے پیشِ نظر رکھے، اور علم و ادراک کے دائرے سے آگے بڑھ کر انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔

وقت سے استفادہ کی حرص

ایک مسلمان پر وقت کے تعلق سے سب سے پہلی ذمّہ داری یہ عاید ہوتی ہے کہ وہ اُسی طرح اس کی حفاظت کرے، جس طرح اپنے مال و اسباب کی حفاظت کرتا ہے ــ بلکہ اس سے بھی زیادہ ــ وہ اپنے اوقات سے استفادے کا حریص ہو، اپنے اوقات ایسے کاموں میں لگائے جن کا فائدہ اُسے دنیا و آخرت دونوں جگہ پر پہنچے۔

ہمارے اسلاف اپنے اوقات سے استفادہ کے معاملے میں سب سے

زیادہ حریص تھے اس لیے کہ وہ اس کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو تمہاری حرص درہم و دینار سے زیادہ اپنے اوقات کے حریص تھے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ اپنے اوقات کو مسلسل عمل کے ذریعے ہمیشہ آباد رکھیں اور اس کے بے فائدہ ضائع ہونے سے ہوشیار رہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ شب و روز تمہارے لیے کام کر رہے ہیں اور تم اُن میں کام کرو۔

اُن بزرگوں کے نزدیک بربادیٔ وقت ناراضیِ رب کی علامت تھی۔ اور اُن کا مقولہ تھا کہ وقت دو دھاری تلوار ہے جس کی کاٹ دو طرفہ ہے، اگر تم نے اُسے اپنے حق میں نہ استعمال کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمہارے خلاف استعمال ہوا۔ اسی لیے وہ لوگ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی طرف پیش قدمی کی کوشش کرتے تھے۔ اور ان میں کا ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس کا آج کل سے بہتر ہو اور آنے والا کل آج سے بہتر ہو۔ اُنھیں بزرگوں میں سے کسی کا قول ہے کہ جس کا آج کل جیسا رہا وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج اس کے کل سے بدتر رہا وہ ملعون ہے۔

ان بزرگوں کی یہ شدید خواہش ہوتی تھی کہ ان کا کوئی دن اور اس دن کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہ گزرے جس میں انھوں نے کوئی علم نافع نہ حاصل کیا ہو یا کوئی عمل صالح و مجاہدۂ نفس نہ کیا ہو یا بندگانِ خدا کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچایا ہو۔

وہ تیزی سے گزرتی ہوئی اپنی عمر کے سلسلے میں فکر مند ہوتے تھے کہ وہ یُوں ہی گزر جائے، غُبار کی طرح اُڑ کر ختم ہو جائے یا جھاگ کی طرح خشک

ہوجائے اور اُنھیں اِس کا شعور بھی نہ ہو۔

وہ لوگ اس بات کو وقت کی ناقدری تصور کرتے تھے کہ ان کا کوئی دن اس حال میں گزُرے کہ انھوں نے کوئی کارِ خیر نہ کیا ہو۔

حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ اپنے اُس دن پر نادم ہوتا ہوں جس کا سُورج ڈوب جاتا ہے اور میری عمر کا ایک دن کم ہوجاتا ہے مگر اس میں میرے عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

ایک دُوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ جب میرے اُوپر کوئی ایسا دن گزرتا ہے جس میں کسی ایسے علم کا اضافہ نہیں ہوتا ہے جو مجھے اللہ سے قریب کردے تو میں اس دن کو اپنے لیے بے برکت تصوّر کرتا ہوں۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ جس نے اپنی عُمر کا کوئی دن اس حال میں گزارا کہ نہ تو کسی حق کا فیصلہ کیا، نہ کوئی فرض ادا کیا، نہ مجد و شرف کی بنیاد رکھی، نہ کوئی قابلِ تحسین کام کیا، اور نہ کوئی علم حاصل کیا تو اُس نے اپنے اُس دن کے ساتھ بدسلوکی کی اور اپنے اوپر ظلم کیا۔

وقت کاٹنے والے

ایک طرف ہم اپنے اسلاف کو دیکھتے ہیں کہ وہ وقت کے تعلّق سے انتہائی حریص تھے، اِس لیے کہ انھیں اس کی حقیقی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اور دُوسری طرف ہم آج مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ وقت اس درجہ بے پروائی سے ضائع کر رہے ہیں کہ ان کی یہ بربادئ اوقات تبذیر سے بڑھ کر ظلم وزیادتی تک جا پہنچی ہے۔

حالاں کہ حق تو یہ ہے کہ اوقات کو ضائع کرنے کے سلسلے کی حماقت

مال کو ضائع کرنے کی حماقت سے زیادہ سنگین ہے۔ اور یہ اوقات کو برباد کرنے والے اور اس کے ساتھ ظلم کرنے والے لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سزا کے مستحق ہیں جو مال برباد کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ مال اگر برباد ہو جائے تو اس کا بدل ممکن ہے، مگر وقت کی بربادی کا کوئی بدل نہیں ہے۔

آج کل مجلسوں، چوپالوں اور کلبوں میں ہر ایک کی زبان سے بس ایک ہی جملہ سُننے کو ملتا ہے کہ وقت کاٹ رہے ہیں، جسے عام طور پر لوگ وقت گزاری سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ظالم اور وقت کی حقیقت سے غافل لوگ گھنٹوں شطرنج، تاش کے پتّوں اور مختلف کھیلوں میں گزار دیتے ہیں، انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ یہ کھیل حلال ہیں یا حرام اور اسی حال میں وہ نماز، یادِ الٰہی اور دُوسری دینی و دنیوی ذمّہ داریوں سے غافل ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کیا کر رہے ہیں؟ تو اُن کا صاف جواب ہو گا کہ وقت کاٹ رہے ہیں۔ حالاں کہ ان نادانوں کو معلوم نہیں کہ وہ وقت کو نہیں بلکہ حقیقت میں اپنے آپ کو کاٹ رہے ہیں۔ یہ درحقیقت سُست رفتار خودکشی ہے جس کا ارتکاب برسرِ عام ہو رہا ہے، مگر کوئی اس پر مواخذہ کرنے والا نہیں ہے، لیکن جسے اُس کی سنگینی کا احساس نہ ہو وہ اس پر مواخذہ کیسے کر سکتا ہے؟!

خالی وقت کو غنیمت جاننا

فرصت و فراغت کی نعمت بھی اُن نعمتوں میں سے ایک ہے جن سے اکثر لوگ غافل ہیں، اور اُن کی قدر و قیمت سے بالکل ناواقف ہیں، اِسی لیے حقیقی معنوں میں اُن کا شکر ادا نہیں کرتے ہیں۔

امام بخاریؒ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اُن میں بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ایک تندرستی، اور دوسری فراغت۔" یعنی وقت پر ان کی قدر نہیں کرتے ہیں، اور جب یہ نعمتیں اُن سے چھن جاتی ہیں تو کفِ افسوس ملتے ہیں۔

اور یہ اُن بہت سی واضح نصوص کے منافی نہیں ہے۔ جو انسان کو کسبِ رزق اور طلبِ معاش پر اُبھارتی ہیں، ہاں یہ چیزیں اُس وقت منافی ہوں گی جب انسان کو دنیوی زندگی اور اس کے مطالبات میں غرق کر دیں، اور اسے اللہ کے حقوق کی ادائی سے غافل کر دیں۔

غبن دراصل خرید و فروخت اور تجارت میں ہوتا ہے۔ علامہ مناویؒ کے بقول یہاں انسان کو تاجر سے تشبیہ دی گئی ہے، اور صحت و فراغت کو راس المال سے۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں حصولِ نفع کے اسباب میں سے ہیں، اور یہ انسان کی کامیابی کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔۔ اس لیے جو شخص اللہ کے ساتھ اطاعت و فرماں برداری کا معاملہ کرے گا وہ فائدے میں رہے گا۔ اور جو شیطان کی پیروی کرے گا وہ اپنے سرمائے کو برباد کر دے گا۔

اور ایک دوسری حدیث جس میں "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جاننے کا ذکر ہے اس میں ایک یہ بھی ہے کہ اپنی فرصت کے اوقات کو مشغولیت سے پہلے غنیمت جانو۔"

فراغت ہمیشہ فراغت نہیں رہتی ہے، بلکہ اس کا خیر یا شر سے پُر ہونا ناگزیر ہے، جو شخص اپنے آپ کو حق کے کاموں میں مشغول نہیں رکھتا ہے وہ باطل کے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اِس لیے قابلِ ستائش ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی فرصت کے اوقات کو خیر و صلاح کے کاموں میں استعمال کیا، اور ہلاکت و بربادی ہو

اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنی فراغت کو شر و فساد سے بھر دیا۔

بعض صالحین کا قول ہے کہ فراغتِ وقت ایک عظیم نعمت ہے لیکن جب بندہ اِس نعمت کی ناقدری کرتا ہے بایں طور کہ اپنے اوپر خواہشِ نفس کا دروازہ کھول لیتا ہے، اور شہوانی خواہشوں کے پیچھے بگٹٹ بھاگتا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر بے چینی اور بے سکونی مسلط کر دیتا ہے اور اس کی صفائیٔ قلب کو سلب کر لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اَسلاف اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ آدمی بے کار بیٹھا رہے ــــ نہ وہ دین کا کام کرے اور نہ دنیا کا۔ اس صُورت میں یہ فراغت بجائے نعمت کے فارغ شخص کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ اور اس میں مرد اور عورت سب یکساں ہیں۔ چنانچہ مشہور قول ہے کہ فراغت مَردوں کے لیے غفلت کا باعث ہے، اور عورتوں کے لیے بے حیائی میں پڑنے کا۔ عزیزِ مصر کی بیوی کی یُوسف علیہ السّلام پر فریفتگی اور دیوانگی اور اُنھیں اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش صرف اس کی بے کاری اور فراغت کا نتیجہ تھی۔

اِس فراغت کی سنگینی اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے، جب اس کے ساتھ جوانی بھی جمع ہو جائے اور وہ جنسی قوت اور یافت کے ذریعے نمایاں ہو، یعنی وہ مالی قدرت حاصل ہو جو انسان کے لیے ہر دل پسند چیز کا حصول ممکن بنا دے۔

خیر کے کاموں میں سبقت

مومن کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ اپنے اوقات کو حتی الاِمکان خیر اور بھلائی کے کاموں سے معمور رکھے اور اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی سُستی، درماندگی

اور ٹال مٹول کو روا نہ رکھے ۔۔۔

اسی لیے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی امت کو جو اذکار اور دعائیں سکھائی ہیں اُن میں سے صبح و شام کے لیے یہ دُعا ہے :

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الۡھَمِّ وَالۡحُزۡنِ وَاَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الۡعَجۡزِ وَالۡكَسَلِ"

ترجمہ : اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں رنج و غم سے ، اور تیری پناہ مانگتا ہوں سُستی اور کسل مندی سے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خیر اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرنے کا حکم دیتا ہے ، قبل اس کے کہ دُوسری مشغولیات اور دُشواریاں اِن کاموں سے غافل کر دیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا ؕ (البقرہ : ۱۴۸)

ترجمہ : ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے ، جس کی طرف وہ مُڑتا ہے ۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو ۔ جہاں بھی تم ہو گے اللہ تمہیں پالے گا ۔

اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب اور اُن کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۔ (المائدہ : ۴۸)

ترجمہ : اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بھی بنا سکتا تھا ، لیکن اُس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا اس میں

تمہاری آزمائش کرے ، لہٰذا بھلائیوں میں ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خُدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ جنّت اور اس کی نعمتوں کی طرف رغبت دلاتے ہوتے فرماتا ہے:

وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔ (آل عمران : ۱۳۳)

ترجمہ: دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس کی جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے، جو خُدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے۔

اور ایک دُوسری آیت میں فرمایا ہے:

سَابِقُوٓا اِلٰی مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا کَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ۔ (حدید : ۲۱)

ایک دُوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے۔

اِن آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جنّت اور مغفرت کے حُصول کے لیے مسارعہ اور مسابقہ (جلدی کرنا اور سبقت کرنا) کا حکم دے کر دراصل ان کے اسباب یعنی ایمان، تقویٰ اور عمل صالح کے لیے سبقت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اِن امور میں مقابلہ آرائی اور مسابقت کا جذبہ مطلوب بھی ہے اور پسندیدہ بھی ہے:

وَفِیۡ ذٰلِکَ فَلۡیَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ۔ (المطففین : ۲۶)

ترجمہ: اور انھیں امور میں مقابلہ کرنے والوں کو مقابلہ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض برگزیدہ نبیوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا ط وَکَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ۝ (الانبیآ: ۹۰)

ترجمہ: یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے، اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

اور اہل کتاب کے صالحین کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے:

یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ ط وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۱۴)

ترجمہ: یہ لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں۔

اسی طرح منافقین کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی۔ (النسا: ۱۴۲)

ترجمہ: جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے اُٹھتے ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ۔ (التوبہ: ۵۴)

ترجمہ: یہ نماز کے لیے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ
خُدا میں خرچ کرتے ہیں تو با دِلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔

نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اعمالِ صالحہ میں جلدی کرنے کا حکم فرماتے تھے۔ ایک بار آپؐ نے نیک اعمال میں تاخیر نہ کرنے اور اُنھیں جلد انجام دینے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: "لگتا ہے تم تو بس سرکش بنا دینے والی مالداری کے منتظر ہو، یا سب کچھ بھُلا دینے والی محتاجی کے، یا برباد کر دینے والی بیماری کے، یا سٹھیا دینے والی عمر رسیدگی کے، یا کام تمام کر دینے والی موت کے، یا دجّال کے جو آنکھوں سے اوجھل ایک ایسی بُری چیز ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، یا پھر قیامت کے جو سب سے بڑی آفت ہے اور سب سے تلخ گھڑی ہے۔"
(ترمذی)

ایک اور حدیث میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "جو شخص آخرِ شب میں دشمن کی غارت گری کا خوف رکھتا ہے وہ اوّلِ شب میں چل پڑتا ہے اور جو اوّلِ شب میں چل دیتا ہے وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ خبردار! اللہ کا سامان یا متاع بہت قیمتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ۔ اللہ کی متاع جنّت ہے۔"
(رواہ الترمذی)

مرورِ ایّام سے عبرت پزیری

مومن کو چاہیے کہ شب و روز کی آمد و شد سے اپنے لیے سامانِ عبرت حاصل کرے۔ اس لیے کہ شب و روز ہر نئی چیز کو پُرانی بنا دیتے ہیں، ہر بعید کو قریب کر دیتے ہیں، عمروں کو سمیٹ دیتے ہیں، چھوٹوں کو بوڑھا بنا دیتے ہیں اور بوڑھوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔

بلاشبہ گردشِ لیل ونہار میں بڑا سامانِ عبرت ہے، اس لیے مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں سے عبرت حاصل کرے اور غور و فکر سے کام لے۔ ہر دن جو گزرتا ہے، بلکہ ہر گزرنے والے لمحے میں اس کائنات اور انسانی زندگی کے اندر کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور رُونما ہوتا ہے، اُن میں سے کچھ نظر آتے ہیں اور کچھ نہیں، کچھ کا علم ہوتا ہے اور کچھ کا نہیں ہوتا، کتنی زمینیں زندہ ہوتی ہیں اور کتنے دانے اُگتے ہیں، کتنے پودے لہلہاتے ہیں، کتنے پھُول بارآور ہوتے ہیں، کتنے پھل توڑ لیے جاتے ہیں اور فصلیں سوکھ کر بھُس بن جاتی ہیں اور ہوا اُنھیں اُڑائے لیے پھرتی ہے، یا رحمِ مادر میں کتنے جنین بنتے ہیں، کتنے بچّے پیدا ہوتے ہیں، بچّے جوان ہوتے ہیں اور جوان ادھیڑ ہوتے ہیں، ادھیڑ بوڑھا ہوتا ہے اور بوڑھا مرجاتا ہے۔ اسی طرح گردشِ ارض وسما کے ساتھ ساتھ لوگوں کے احوال میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً آسانی و دشواری، مالداری و محتاجی، صحت و بیماری، خوشی و غم، تنگی و فراخی اور خوش حالی و بدحالی۔ غرض کہ ان سب چیزوں میں عقل مندوں کے لیے نشانی، اہلِ دل کے لیے یاددہانی اور اہلِ بصیرت کے لیے سامانِ عبرت ہے۔ ہاں جو شخص عقل مندوں کی فکر سے، اہلِ دل کے احساس اور اہلِ نظر کی نظر سے محروم ہوگیا ہو اُس کے لیے یہ سارا کارخانۂ ہست و بود بے سود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (آل عمران: ۱۹۰)

ترجمہ: زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اور ایک دُوسری آیت میں فرماتا ہے:

يُقَلِّبُ اللّٰهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔

(النور : ۴۴)

ترجمہ : رات اور دن کا اُلٹ پھیر اللہ ہی کر رہا ہے ۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

تنظیمِ وقت

مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور مختلف کاموں کے درمیان اپنے اوقات کو منظم اور منضبط کرے ، وہ کام چاہے دینی ہوں یا دنیوی ۔ اور جو کام جس اہمیت اور جس ترتیب کا حامل ہو اُس کو اسی اہمیت اور ترتیب سے انجام دینا چاہیے ۔ بعض کام کا وقت متعین ہوتا ہے اور بعض کا نہیں ہوتا ہے ، اس لیے انھیں کسی وقت بھی انجام دیا جاسکتا ہے ۔ اسی طرح ایک کام عجلت کا طالب ہوتا ہے تو اس کو فوراً انجام دینا چاہیئے ۔ اوقات کی اس تنظیم اور ترتیب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف کاموں کے درمیان تصادم کا اندیشہ ختم ہو جاتا ہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحفِ ابراہیمؑ کی کچھ تعلیمات اِس طرح بیان فرمائی ہیں : " عقل مند آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کو چار حصّوں میں تقسیم کرے ۔ ایک حصّہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کے لیے ، دُوسرا احتسابِ نفس کے لیے ، تیسرا اللہ کی تخلیق میں غور و فکر کے لیے اور چوتھا حصّہ اپنے کھانے پینے کی ضروریات کے لیے خاص کرے ۔"

وقت کی تقسیم اور تنظیم کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہے جن کے پاس بہت ساری ذمّہ داریاں ہیں اور ان کے سَر پر کاموں کا بہت زیادہ بوجھ رہتا ہے ۔ تاکہ اُنھیں اِس بات کا احساس ہو کہ ذمّہ داریاں اُن کے اوقات

سے بڑھی ہوئی ہیں۔

جب آدمی اپنے اوقات کی تنظیم کر رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک حصہ اپنے آرام و راحت کے لیے بھی فارغ کرے، اِس لیے کہ نفس دیر تک محنت کرنے سے اُکتا جاتا ہے، اور دل بھی تھک جاتا ہے جس طرح جسم تھک جاتا ہے۔ اس لیے وقت کا کچھ حصّہ مباح کھیل اور تفریح کے لیے بھی نکالنا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دل کو آرام پہنچاتے رہو، اس لیے کہ دل کو جب مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔

کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے کو کام میں اتنا تھکا دے کہ اُس کی قوتِ کارکردگی کمزور پڑ جائے اور اس کی رفتارِ کار کا تسلسل ہی ٹوٹ جائے۔ اور اس طرح وہ اپنے نفس، اپنے اہل وعیال اور اپنے معاشرے کے حقوق پامال کر بیٹھے۔ خواہ یہ تھکن اللہ کی عبادت روزہ و نماز اور اطاعت وزہد ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اصحاب کو رات میں آپؐ کے پیچھے کثرتِ نماز میں مقابلہ کرتے دیکھا تو فرمایا: "اُتنا ہی کرو جتنی تم میں طاقت ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نہیں اُکتاتا تاآنکہ تم لوگ اُکتا جاؤ، اللہ کے نزدیک بہتر اعمال وہ ہیں جن کی پابندی کی جائے، خواہ وہ تھوڑے ہی ہوں۔"

ایک دُوسرے موقع پر آپؐ نے فرمایا: "بلا شُبہ دین آسان ہے۔ جو کوئی دین کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے گا، دین اُس پر غالب آجائے گا۔ میانہ روی اختیار کرو، اور وہ عمل کرو جو دین کی رُوح سے قریب تر ہو، اور تھوڑے عمل پر مداومت کرکے ثواب کی بشارت حاصل کرو۔"

ایک بار آپؐ نے قرأت، قیام اور روزہ میں انتہائی جدّ و جہد کرنے والوں

کو میانہ روی اور اعتدال کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "بلاشبہ تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں کا تم پر حق ہے۔"

ایک بار آپؐ نے زہد و اطاعت میں غلو کرنے والی ایک جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں قیام اللیل بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا ہوں، عورتوں سے شادی کرتا ہوں، جو کوئی میرے طریقے کو ناپسند کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" (رواہما البخاری)

یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے اور یہی آپؐ کا طریقہ، زندگی ہے۔ یہ مادّیت اور روحانیت کے درمیان اعتدال و توسّط کی راہ ہے، اور لذّتِ نفس اور رب کے حقوق کے درمیان بہترین توازن ہے۔ اسی لیے اسلام کی نگاہ میں انسان کے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ کھیل کود میں گزارے، اور حلال اور پاکیزہ چیزوں کے ذریعے اپنے نفس کو راحت پہنچائے۔

یہی وجہ ہے کہ جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت حنظلہؓ کے بارے میں سُنا کہ وہ اپنے آپ پر منافق ہونے کا الزام محض اس بنا پر عاید کر رہے ہیں کہ اُن کی جو حالت آپؐ کی مجلس میں ہوتی تھی وہ اپنے گھر اور اہل وعیال میں نہیں ہوتی تھی۔ یہ سُن کر آپؐ نے اُن سے فرمایا: "اے حنظلہ اگر تم لوگ اس حالت پر باقی رہو جو میری مجلس میں ہوتی ہے تو تم سے فرشتے راستوں میں مصافحہ کریں، لیکن اے حنظلہ وقفہ وقفہ سے ——" (رواہ مسلم) —— یہ ہے ایک مسلمان کی شان کہ کچھ وقت اپنے رب کے لیے مخصوص کرے اور کچھ وقت اپنے دل کے لیے۔

ایک قصّہ بہت مشہور ہے کہ اصمعی نے ایک دیہات میں کسی عورت کو دیکھا کہ

اُس کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور وہ کھڑی سُرمہ لگا رہی ہے اور بناؤ سنگار کر رہی ہے، اس پر اصمعی نے اس سے پُوچھا کہ ان دونوں چیزوں میں کیا ربط ہے؟" یعنی اُسے یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک عورت ذکر و تسبیح کرنے والی ہے اور ساتھ ہی اپنی آرائش و زیبائش میں لگی ہوئی ہے۔" اُس کے سوال پر عورت نے جواب میں یہ شعر کہا۔ ع

وَلِلّٰہِ مِنِّیْ جَانِبٌ لَا اُضِیْعُہٗ

وَلِلَّھْوِ مِنِّیْ وَالْبِطَالَۃِ جَانِبٌ

"میرے معمولات میں اللہ کے لیے ایک خاص پہلو ہے جس سے میں توجہ نہیں ہٹاتی ہوں اور اسی طرح تفریح اور فراغت کے لیے بھی ایک پہلو ہے۔

اُصمعی نے کہا کہ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی نیک خاتون ہے اور شوہر والی ہے جس کے لیے سنگار کر رہی ہے۔

ہر کام کا ایک وقت ہے

مومن کو چاہیے کہ وہ وقت کے مطالبات کو پہچانے کہ وہ اس کی زبان و قلب اور اعضاء و جوارح کس عمل کے طالب ہیں۔ اس کی جستجو میں رہے اور اس کو بروقت انجام دینے کی کوشش کرے تاکہ مناسب طریقے سے اپنے مقصود کو حاصل کر سکے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبولیت کا درجہ بھی پا سکے۔

اِسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین بناتے ہوئے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جان لو! اللہ کے لیے کچھ کام دن میں کرنے کے ہیں جن کو وہ رات میں قبول نہیں فرماتا اور کچھ کام رات میں کرنے کے ہیں جن کو دن میں قبول نہیں فرماتا۔

اس لیے اہم بات یہ نہیں ہے کہ انسان جب چاہے جو عمل کرے، بلکہ اہم

بات یہ ہے کہ مناسب کام مناسب وقت پر انجام دے۔ اسی بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سی عبادات اور فرائض کو اوقات کے ساتھ محدود کر دیا ہے، جس میں تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہے۔ اور یہ کہ کوئی عمل نہ اپنے محدود وقت سے پہلے قبول ہوتا ہے اور نہ بعد میں۔ نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ (النساء: ۱۰۳)

ترجمہ: نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندئ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

اور روزے کے بارے میں فرمایا:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (البقرہ: ۱۸۵)

ترجمہ: جو شخص اس مہینے — رمضان — کو پائے اس کو لازم ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

اِسی طرح حج سے متعلق فرمایا:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ۔ (البقرہ: ۱۹۷)

ترجمہ: حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔

اور زکوٰۃ سے متعلق فرمایا:

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ۔ (الانعام: ۱۴۱)

ترجمہ: اور اللہ کا حق ادا کرو جب اُن کی فصل کاٹو۔

دِل کا عمل بھی زبان کے عمل کی طرح ہے، اس لیے اس کو بھی اس کے وقت ہی میں انجام دینا ضروری ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے: بندے کے اوقات چار قسم کے ہیں، ان میں پانچویں قسم نہیں ہے: نعمت، مصیبت، اطاعت اور

معصیت ، اور تمہارے ذمّے خدا کے لیے ہر وقت میں بندگی کا ایک حصّہ ہے جسے تمہیں اُسی کی مرضی کے مطابق انجام دینا ہے ۔

جس کا وقت اطاعت و فرماں برداری میں گزرے اُس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہو کہ اُس نے اسے اپنی اطاعت کے کاموں کی ہدایت دی ، اور ان کو انجام دینے کی توفیق بخشی ۔ اور جس کا وقت نعمتوں میں گزرے اُس کا شیوہ شکر ہے ۔ اور شکر دراصل اللہ تعالیٰ سے خوش دِلانہ تعلق کا نام ہے ۔

اِسی طرح جس کا وقت خدا کی نافرمانی اور معصیت میں گزرے اُسے توبہ اور استغفار کرنا چاہیے ، اور جس کا وقت مصیبت میں گزرے اُسے صبر اور رضا کا راستہ اختیار کرنا چاہیے ، اور رضا دراصل نفس کا اللہ سے راضی ہونا ہے ۔ اور صبر دراصل اللہ کے حکم پر ثابت قدمی اور استقامت ہے ۔

اور جو کچھ بزرگ نے کہا ہے وہ حقیقت میں قرآن و سنّت کی سچّی تعبیر ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقامِ اطاعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (یونس : ۵۸)

ترجمہ : اے نبیؐ کہو کہ " یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز "قرآن"، اس نے بھیجی ، اِس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے ، یہ اُن سب چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ سمیٹ رہے ہیں "

اور مقامِ نعمت کا ذکر کرتے ہوئے یُوں فرماتا ہے :

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۔ (سبا : ۱۵)

ترجمہ : کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اُس کا ، ملک ہے

عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار بخشش فرمانے والا۔

اسی طرح سورۃ الزُّمَر آیت ۔۵۳ میں مقام معصیت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ (الزمر: ۵۳)

ترجمہ: (اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفورٌ رحیم ہے۔

اللہ جلّ شانہ نے آزمائش اور مُصیبت کے وقت ایک مومن کے کردار کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ ۔ (البقرہ: ۱۵۵ - ۱۵۶)

ترجمہ: اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مُبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مُصیبت پڑے، تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے، اُنھیں خوش خبری دے دو۔

اور صحیح مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت ہے کہ " مومن کا معاملہ عجیب ہے، بلاشبہ اُس کی ہر روش اُس کے لیے بہتر ہے، اور یہ صرف مومن کے لیے مخصوص ہے، اگر وہ خوش حالی سے ہم کنار ہوتا ہے تو اللہ کا شکر بجالاتا ہے، اور یہ اس کے

حق میں بہتر ہے ، اور اگر وہ بد حالی سے دو چار ہوتا ہے تو صبر سے کام لیتا ہے ، اور یہ اُس کے لیے بہتر ہے ۔"

افضل وقت کی تلاش

جو لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کے دل دادہ ہوں ، اُنھیں چاہیے کہ اُن اوقات کی تلاش و جستجو کریں ، جنھیں اللہ تعالیٰ نے رُوحانی خصوصیات سے نوازا ہے ، اور اُن کے ذریعے اُنھیں دوسرے اوقات پر فضیلت بخشی ہے ۔ احادیث میں ان مبارک اوقات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے ۔ اور یہ تخصیص صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے ، اور جس چیز کو چاہتا ہے عام کر دیتا ہے ۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے :

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ

(القصص : ۶۸)

ترجمہ : تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے ، یہ انتخاب اُن لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے سحر کے اوقات کو رات پر فضیلت بخشی ہے ۔ اور یہ رات کا آخری تہائی حصہ ہے ۔ اس میں اللہ سبحانہ جلوہ فرما ہوتا ہے اور پکار کر کہتا ہے :

"ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ اُس کو بخش دوں ؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کی توبہ میں قبول کر لوں ؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ اُسے دوں ، ہے کوئی پکارنے والا کہ اس کی سُنوں ۔ یہ سلسلہ طلوعِ فجر تک چلتا رہتا ہے ۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پرہیزگار اور نیکوکار بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا :

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ لا اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ط كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ (الذاریات ۱۵-۱۸)

ترجمہ : بلاشبہ متقی لوگ اُس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے ، جو کچھ اُن کا رب اُنھیں دے گا اُسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے ۔ وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے ، راتوں کو کم ہی سوتے تھے ، پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اللہ اپنے بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتا ہے ، اگر تم ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہو ــــ جو اس وقت میں اللہ کو یاد کرتے ہیں ــــ تو ہو جاؤ ۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دنوں میں جمعہ کے دن کو فضیلت بخشی ہے ، اور یہ مسلمانوں کے لیے ہفتے کی عید ہے ۔ اور اُسی دن جمعہ کی فرض نماز اور جمعہ کی ملاقات ہے ۔ اور اُسی میں ایک گھڑی مقبولیت کی ہے ، جو مسلمان اُس میں خیر کی دُعا کرتا ہے اللہ اُسے قبول فرماتا ہے ۔

صحیح حدیث میں ہے کہ " جو شخص اولِ وقت میں نماز جمعہ کے لیے مسجد جاتا ہے تو اُسے اُونٹ کی قربانی کا اجر ملتا ہے ۔ اور جو اس کے بعد گیا تو اُسے گائے کی قربانی کا اجر ملے گا ، اور جو اس کے بعد گیا تو گویا اس نے بکری قربان کی ، یہاں تک کہ مُرغی اور انڈے کی نوبت آتی ہے ۔ اور جب خطیب منبر پر چڑھ جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر بند کر دیتے ہیں ۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پورے سال کے ایام میں ذوالحجہ کے دس دنوں کو فضیلت بخشی ہے، اور اُن میں بھی سب سے افضل "عرفہ" کا دن ہے۔ بلکہ یہ بالاتفاق سال کا سب سے افضل دن ہے۔

صحیح بخاری میں عبداللہ ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دس دنوں کے اعمال اللہ کو سارے دنوں سے زیادہ پسند ہیں۔ لوگوں نے کہا: یارسُول اللہ جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں، آپؐ نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں، اِلّا یہ کہ آدمی اپنی جان ومال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلے اور پھر اُن میں سے کچھ واپس لے کر نہ لوٹے"۔

مہینوں میں اللہ نے ماہِ رمضان کو فضیلت عطا کی ہے، یہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق وباطل کا فرق کرنے والی ہیں۔ اسی میں روزہ فرض کیا گیا اور قیام اللیل کو مسنون قرار دیا گیا۔ اس مہینے میں نیکیوں کی کثرت مستحب ہے۔ یہ مہینہ مومنوں کے لیے فصلِ بہار، صالحین کے لیے موسمِ تجارت اور نیکیوں میں سبقت کرنے والوں کے لیے میدانِ مسابقت ہے۔ ہمارے بزرگ اس ماہِ مبارک کی آمد کا انتظار بڑے جذب وشوق سے کیا کرتے تھے، اور جب یہ مہینہ آجاتا تو کہتے تھے:

خوش آمدید! اے پاک کرنے والے۔

اس لیے کہ انہیں یقین ہوتا تھا کہ وہ اس ماہِ مبارک کے ذریعے اپنے عیوب کی گندگی دھولیں گے اور گناہوں کی نجاستوں سے اپنے کو پاک و صاف کرلیں گے ـــــ کیوں کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

عُبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن رمضان کی آمد پر فرمایا :

"تمہارے پاس رمضان کا بابرکت مہینہ آگیا، اِس میں اللہ تمہیں ڈھانپ لیتا ہے، اور اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے، گناہوں کو معاف فرماتا ہے، دُعائیں قبول کرتا ہے۔ نیکیوں کے معاملے میں تمہارے جذبۂ مسابقت کو دیکھتا ہے، اور اپنے فرشتوں پر فخر کرتا ہے ۔۔۔ تم اللہ کو اپنی طرف سے زیادہ سے زیادہ خیر دکھاؤ، اس لیے کہ وہ آدمی انتہائی بدبخت ہے جو اس مہینے میں اللہ کی رحمت سے محروم ہوگیا۔" (الجامع الکبیر للسیوطی)

اگرچہ رمضان کا پُورا مہینہ اہمیت کا حامل ہے، لیکن اُس کا آخری عشرہ دو اسباب سے انتہائی اہم ہے :

اوّلاً : یہ مہینے کا آخری حصّہ ہے، اور اعمال کا اعتبار خواتیم (آخری اعمال) سے ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے : "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمْرِیْ اٰخِرَہٗ، وَخَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِمَہٗ، وَخَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ اَلْقَاکَ"۔ "اے اللہ میری آخری عمر کو بہتر بنادے اور میرے آخری اعمال کو بہتر بنادے، اور میرا بہتر دن اپنی ملاقات کے دن کو بنادے۔"

ثانیاً : اس عشرہ میں شبِ قدر کا یقین ہوتا ہے، یہ وہ رات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہزار مہینوں سے بہتر بنایا ہے، اور اس کی فضیلت میں مستقل ایک سورۃ "سُورۃ القدر" نازل فرمائی ہے۔

نصِ قرآنی سے رمضان میں اس رات کا ہونا یقینی ہے، اور احادیث میں بھی رمضان کے آخری عشرے میں شبِ قدر کو تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب رمضان کے آخری عشرے میں داخل ہوتے تو چاق چوبند ہو جاتے، شب بیداری کرتے اور اپنی ازواج مطہراتؓ کو بھی جگاتے اور اعتکاف بھی فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مہینوں میں رمضان کے بعد اَشْھُرِ حُرُم (محترم مہینے) کو فضیلت دی، اور وہ رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرّم کے مہینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ۔ (التوبہ - ۳۶)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے، اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے، اور ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔ یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔ لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔

مسلمانوں کی روز مرّہ کی زندگی کا نظام

اگر کسی کے دل میں خواہش ہو کہ اس کی عمر میں برکت ہو تو اُس نظام کے مطابق چلے جو اسلام نے روزانہ کی زندگی کے لیے تجویز کیا ہے، اسی نظام پر چل کر وہ دنیوی کامیابیوں سے بھی ہم کنار ہو سکتا ہے اور اُخروی سے بھی۔

اس نظام الاوقات کا تقاضا ہے کہ آدمی سویرے بیدار ہو اور سویرے سو جائے۔ چوں کہ مسلمان کے دن کا آغاز طلوعِ فجر یا کم از کم طلوعِ شمس سے پہلے ہوتا ہے، اِس لیے وہ صاف ستھری اور پاکیزہ صبح سے ہم کنار ہوتا ہے جب کہ وہ ان گنہگاروں کے انفاس کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے جو دن چڑھنے پر اپنی نیند سے بیدار

ہوتے ہیں۔

اِس طرح مسلمان صبح تڑکے اپنے دن کا استقبال کرتا ہے۔ اور یہ وقت ہے کہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے لیے برکت کی دُعا فرمائی ہے: "اے اللہ میری اُمّت کے لیے صبحِ صادق میں برکت دے۔" (رواہ أحمد وأصحاب السنن)

آج کا مسلمان جن آفتوں سے دوچار ہے اُن کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی روزمرہ کی زندگی کا نظام بدل ڈالا ہے، رات میں سویرے سونے کے بجائے دیر تک جاگتا ہے، اور پھر اس طرح سوتا ہے کہ صبح کی نماز بھی ضائع ہوجاتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ "تعجب ہے اس شخص پر جو صبح کی نماز سُورج نکلنے کے بعد پڑھتا ہے۔ ایسے شخص کو کیسے روزی ملے گی ؟!"

امام بخاریؒ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم میں سے جب کوئی سویا ہوتا ہے تو شیطان اُس کی گُدّی پر تین گرہیں لگاتا ہے، اور ہر گرہ پر کہتا ہے کہ ابھی رات طویل ہے، تو سویا رہ۔ لیکن جب وہ شخص بیدار ہوکر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کُھل جاتی ہے، اور جب وضو کرتا ہے تو دُوسری گرہ کُھل جاتی ہے، اور جب وہ نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ بھی کُھل جاتی ہے، اِس طرح اُس کی صبح پُرنشاط اور خوش گوار ہوتی ہے۔ اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کے نفس میں خباثت اور جسم میں سُستی ہوتی ہے۔"

کتنا بڑا فرق ہے اُس مسلمان میں جس کی شیطانی گرہیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں کہ جس کے سر پر شیطانی گرہیں موجود ہوتی ہیں۔

پہلا شخص اپنے دن کا استقبال صبحِ صادق ہی سے ذکر، طہارت اور نماز کے ساتھ کرتا ہے، اور نشاط و خوش گواری اور انشراحِ صدر کے ساتھ کارگاہِ حیات کی طرف رواں دواں ہوجاتا ہے۔ اِس کے برعکس دوسرا شخص دن چڑھے تک

سوتا ہے، اور اس کے نفس میں خباثت اور جسم میں گرانی اور بوجھل پن ہوتا ہے، اس کے قدم بھی نہایت سُست رفتاری سے اُٹھتے ہیں، اس طرح اُسے دن بھر سُستی گھیرے رہتی ہے۔

مسلمان اپنے دن کا آغاز اللہ کی اطاعت و بندگی کے کاموں سے کرتا ہے۔ فرائض وسُنن ادا کرتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول صبح کے اذکار کا ورد کرتا ہے۔ مثلاً:

"أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔"

ترجمہ: ہم اللہ کے ہیں اور بادشاہی بھی اللہ کی ہے، اور شکر و تعریف کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور اُسی کے حضور دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔"

"اَللّٰهُمَّ مَا أَصْبَحَ بِيْ مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِّنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔"

ترجمہ: "اے اللہ! جو بھی نعمت مجھ کو ملی ہے یا تیری مخلوق میں کسی کو بھی حاصل ہوئی ہے وہ صرف تیری عطا و بخشش ہے۔ تیرا کوئی شریک اور ساجھی نہیں، تمام تعریفیں اور ہر طرح کا شکر تیرے ہی لیے ہے۔"

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَصْبَحْتُ مِنْكَ فِيْ نِعْمَةٍ وَعَافِيَةٍ وَسِتْرٍ، فَأَتِمَّ نِعْمَتَكَ عَلَيَّ وَعَافِيَتَكَ وَسِتْرَكَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔"

ترجمہ: اے اللہ! تیرے ہی فضل سے مجھ کو ہر نعمت، عافیت، اور

حفاظت حاصل ہوئی ہے۔ سو میری تجھ سے دُعا ہے کہ تو مجھ پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ اپنی نعمت، عافیت اور حفاظت کا اِتمام فرما دے۔"

پھر حسبِ توفیق قرآن کا کچھ حصّہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کی کوشِش کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ص: ۲۹)

ترجمہ: یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اُس سے سبق لیں۔

مومن ان سارے امور سے فارغ ہوکر اعتدال کے ساتھ ناشتہ کرتا ہے اور پھر روزمرہ کے کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور تدبیرِ معاش اور طلبِ رزق کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتا ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے کو کسی نہ کسی حلال کام میں مشغول رکھے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحبِ ثروت اور مال دار کیوں نہ ہو، اور خواہ اُس کی مشغولیت صرف نگرانی اور دیکھ بھال کی حد تک ہی کیوں نہ ہو، اِس لیے کہ چھوڑا ہوا مال چوری کی نذر ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سُود کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں کسی کد و کاوش، شرکت اور اندیشے کے بغیر مال لازمی طور پر مال کو پیدا کرتا ہے۔ اور بنیا پورے اطمینان و اعتماد کے ساتھ اپنی گدّی پر بیٹھا رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اُس کے سَو روپے لازماً اس کے لیے ایک سَو دس

اور ہزار روپے ، ایک ہزار ایک سو لائیں گے ، اور اُس پر کسی طرح کی ذمّہ داری بھی نہ ہوگی ۔ یہ اسلام کے نظریۂ انسانیت کے صریحًا خلاف ہے ۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ جس طرح زندگی سے کچھ لیتا ہے ، اسی طرح اُسے کچھ دے بھی ، اور بے کاری و بے روزگاری کی زندگی نہ گزارے کہ کھائے مگر کچھ نہ کرے ، خواہ یہ بے کارباشی اللہ کی عبادت میں یکسوئی ہی کے نام پر کیوں نہ ہو ۔ اس لیے کہ اسلام میں رہبانیت کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔

امام بیہقیؒ نے عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا : " دنیا میں بدترین چیز بے کاری ہے ۔" اور علامہ مناویؒ نے فیض القدیر میں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ جب انسان عمل سے خالی ہوکر بے کار بیٹھا رہتا ہے تو بظاہر وہ خالی نظر آتا ہے مگر اس کا دل طرح طرح کی بے ہودہ چیزوں میں مشغول ہوتا ہے ، بلکہ شیطان اس میں اپنا آشیانہ بنا لیتا ہے اور اسی میں انڈے ، بچّے دیتا ہے ۔

اِسی لیے حضرت عمرؓ جب کسی تندرست آدمی کو دیکھتے تو اس کے بارے میں لوگوں سے دریافت فرماتے کہ اس کے پاس کوئی ہنر ہے ؟ اگر جواب نفی میں ملتا تو وہ شخص اُن کی نظر سے گر جاتا ۔

ایک بزرگ نے بے ہُنر آدمی کو اس اُلّو سے تشبیہ دی ہے جو کھنڈر میں رہتا ہے اور اس کے وجود سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا ۔

مسلمان اپنے دنیوی عمل کو بھی عبادت اور جہاد سمجھتا ہے جب کہ نیت درست ہو ، اور وہ عمل اُسے یادِ الٰہی سے غافل نہ کردے ، اور اُس نے اپنے اُس عمل کو پوری امانت داری اور عمدگی سے انجام دیا ہو ۔ اس لیے کہ عمدگیٔ عمل ہر مسلمان پر فرض ہے ، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : " بلا شبہ

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان "عمدگی" کو فرض کیا ہے"۔ (رواہ مسلم)
ایک دوسری حدیث میں ہے: "بلاشبہ اللہ کے نزدیک یہ بات پسندیدہ ہے کہ جب تم میں کا کوئی آدمی کوئی کام کرے تو اُسے عمدگی سے کرے"۔
(رواہ البیہقی و ابویعلی، وابن عساکر عن عائشۃ)

اور روزانہ کی وہ ذمہ داریاں جن کا فراموش کرنا یا جن سے غفلت برتنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے وہ یہ ہیں کہ وہ اپنے معاشرے کی خدمت کرے اور اس کے افراد کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرے، اور ان کے معاملات میں آسانی پیدا کرے، تاکہ اس کا یہ عمل اس کے لیے صدقہ اور لوگوں کی دعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

ابو موسیٰ رض سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: "ہر مسلمان پر صدقہ ہے"۔ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر وہ نہ پائے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرے، اور اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ کرے، لوگوں نے کہا: اگر یہ نہ کر سکے یا نہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا: کسی پریشان حال حاجت مند کی مدد کرے، لوگوں نے عرض کیا: اگر یہ بھی نہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا: اُسے بھلائی کا حکم دینا چاہیے۔ لوگوں نے کہا: اگر یہ بھی نہ کیا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ بُرائی سے باز رہے، اس لیے کہ یہ بھی صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

یہ صدقہ اور اجتماعی ٹیکس ہر مسلمان پر روزانہ فرض ہوتا ہے، بلکہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ہر جوڑ اور ہر مسام پر طلوعِ شمس کے ساتھ صدقہ واجب ہے، اس طرح مسلمان اپنے گرد و پیش کے لیے چشمۂ خیر اور امن و سلامتی کا منبع بن جاتا ہے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں ابو ہریرہ رض سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"روزانہ طلوعِ شمس کے ساتھ لوگوں کے ہر ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے : دو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دینا صدقہ ہے ، کسی آدمی کو اس کی سواری پر سوار کرا دینا اور اس کا سامان اُوپر اٹھا کر اُس کو پکڑا دینا صدقہ ہے ، پاکیزہ بول صدقہ ہے ، نماز کے لیے اُٹھنے والا تمہارا ہر قدم صدقہ ہے ، اور راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے ۔" چوں کہ انسان کے یہ سارے اعضاء خدا کی طرف سے بطور نعمت کے اسے ملے ہیں ، اس لیے اس کی احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ وہ اِن پر اللہ کا شکر بجالائے ، اور شکر گزاری کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء وجوارح کو اللہ کی اطاعت و بندگی ، اس کے بندوں کو بھلائی اور خیر و فلاح کے ہر ممکن کام میں استعمال کرے ۔

اور زوال کے وقت موذن ظہر کی نماز کے لیے اذان دیتا ہے تو مسلمان ادائے نماز کے لیے تیزی سے لپکتا ہے ، اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ نماز اوّل وقت میں ادا کرے اور جہاں تک ہوسکے جماعت کے ساتھ ادا کرے ، اس لیے کہ اوّل وقت میں اللہ کی خوشنودی ہے ، اور اللہ تعالیٰ نے نیکیوں میں مقابلہ کا حکم دیا ہے ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں میں آگ لگانے کا ارادہ فرمالیا تھا جو اذان کی آواز سُن کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں ، اور نماز باجماعت میں شامل نہیں ہوتے ہیں ۔ اور نماز باجماعت کی فضیلت تنہا نماز کے مقابلے میں ستائیس گُنا زیادہ ہے ۔

مسلمان دن کے وسط میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہے ، اللہ کا دیا ہوا پاکیزہ رزق کھاتا ہے ، نہ اتنا زیادہ کھاتا ہے کہ توند نکل آئے ، اور نہ اتنی کفایت شعاری سے کام لیتا ہے کہ احساسِ محرومی ہونے لگے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا

وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ع قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط ۔ (الاعراف: ۳۱،۳۲)

ترجمہ: اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے نبیؐ، اِن سے کہو کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔

گرم ممالک میں وہ بھی خاص طور پر گرمی کے موسم میں کچھ لوگوں کو قیلولہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تھوڑا سا آرام کرتے ہیں، اس کے ذریعے قیام اللیل اور بیداریٔ سحر میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ اِسی قیلولہ کی طرف قرآن نے اِن الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِنَ الظَّھِیْرَۃِ ۔ (النور: ۵۸)

ترجمہ: اور دوپہر کو جب تم کپڑے اُتار کر رکھ دیتے ہو۔

پھر جب عصر کا موذن نماز کے لیے بُلاتا ہے تو مسلمان اگر قیلولہ کر رہا ہوتا ہے تو قیلولہ سے یا اگر کام کر رہا ہوتا ہے تو کام کے ہجوم سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس نماز کے لیے جلدی کرتا ہے، اس لیے کہ یہ نماز انتہائی اہم نماز ہے، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ خرید و فروخت اور کھیل تماشے اُسے اِس نماز سے غافل کر دیں۔ اوقاتِ نماز کی پابندی کرنے والوں کا ذکر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اِس طرح فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ

الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ صلے یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ (النور : ۳۷)

ترجمہ: ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی۔

یہ بات کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ سُستی برتتے ہوئے نمازِ عصر کو ٹالتا رہے یہاں تک کہ سُورج ڈوبنے کے قریب ہو جائے، اس لیے کہ یہ منافقوں کی نماز ہوگی، جیسا کہ نبیؐ کا ارشاد ہے: "یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے۔" وہ سُورج کی ٹکیا کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتی ہے تو وہ اُٹھتا ہے اور چار بار چونچ مار لیتا ہے، اور اس میں اللہ کا ذکر برائے نام کرتا ہے۔

سُورج ڈوبتے ہی مسلمان مغرب کی نماز کے لیے جلدی کرتا ہے تاکہ اوّل وقت میں اس کو ادا کرے، کیونکہ مغرب کا وقت بہت تنگ ہوتا ہے۔ اور فرض و سنّت سے فارغ ہو کر شام کے اذکارِ مسنونہ کا ورد کرتا ہے: مثلاً:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِكَ وَاِدْبَارُ نَھَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِكَ فَاغْفِرْلِیْ"۔

ترجمہ: اے اللہ یہ تیری رات کے آنے اور تیرے دن کے واپس جانے، اور تیرے پکارنے والوں کی آوازوں کا وقت ہے، خدایا تو میری بخشش فرما دے۔"

اور صبح کی وہ دُعائیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں اُن کا وِرد بھی کرنا چاہیے بس فرق صرف اتنا ہے کہ شام کو "أَصْبَحْنَا" کے بجائے "اَمْسَيْنَا" کہنا چاہیے۔ اِن اذکار سے فارغ ہو کر وہ شام کا کھانا کھاتا ہے اور اس کا یہ کھانا اوسط درجے کا ہوتا ہے۔ پھر عشاء کی نماز پڑھتا ہے اور اس کی سنتیں ادا کرتا ہے، اور وتر کو مؤخر کرتا ہے اگر وہ بیداریٔ شب کا عادی ہوتا ہے، ورنہ سونے سے پہلے اُسے ادا کرتا ہے۔

اور وہ کبھی کبھی اپنے شام کے کھانے کو بعد نماز عشاء تک مؤخر کر دیتا ہے، مگر جب شام کا کھانا اور نماز عشاء دونوں تیار ہوں تو کھانے کو مقدم کرتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، ایسا اس لیے ہے کہ مسلمان اس حال میں نماز نہ پڑھے کہ اس کا دل مناجاتِ الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہو۔

سونے سے پہلے مسلمان اپنے بعض حقوق کو ادا کر سکتا ہے مثلاً کسی سے ملاقات کرنا یا ملنے جلنے والے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر تھوڑی دیر میل محبت کی باتیں کرنا وغیرہ۔

اور مسلمان کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے روزانہ کے اوقات میں سے ایک حصّہ پابندی سے مطالعۂ کتب کے لیے مخصوص کرے تاکہ اُس کے علم میں اضافہ ہوتا رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ٥ (طٰہٰ : ۱۱۴)

ترجمہ: اور دُعا کرو کہ اے میرے پروردگار، مجھے مزید علم عطا کر۔

اپنے مطالعے کے لیے ان کتب اور رسائل کا انتخاب کرے جو اس کی دُنیا و دین دونوں کے لیے نفع بخش ہوں۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ تم مجھے بتاؤ کہ کیا پڑھتے ہو؟ تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کون ہو؟

اسی طرح اس کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بعض مباح کھیلوں اور شرعی تفریحات کے ذریعے اپنا جی بہلائے، بس شرط صرف اتنی ہے کہ یہ چیز بندگیٔ رب کی راہ میں مانع نہ ہوں، اور نہ ان کے سبب اُس کی ذات اور اس کے اہلِ خاندان کے حقوق پامال ہوں۔ اسی لیے مسلمان کے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ رات میں دیر تک جاگتا رہے، یہاں تک کہ بعض حقوق کی ادائی میں کوتاہی ہونے لگے۔ گرچہ اُس نے یہ کام بالقصد نہ کیا ہو تب بھی یہ مسلّمہ امر ہے کہ جب ایک پہلو پر زیادتی ہوگی تو دوسرا پہلو لازماً تشنہ رہ جائے گا۔ اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے اُس حکم کے خلاف ہے جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن: ۷تا ۹)

ترجمہ: آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی، اس کا تقاضا ہے کہ "تم میزان میں خلل نہ ڈالو"، انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

اسی طرح وہ دس حقوق جن کی رعایت کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دیا ہے اور جن کا یاد رکھنا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ اُن کی ادائی میں اُسے افراط و تفریط سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ ہر حق کا جو تقاضا ہو اسے پُورا کرنا چاہیے۔ اُن حقوق کی تفصیل قرآن میں اس طرح ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا

مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔ (النساء: ۳۶)

ترجمہ: اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو۔

اِن حقوق میں پہلا اور سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے جو ساری مخلوقات کا خالق اور سارے امور کا مالک ہے، وہی زندگی دینے والا ہے اور ساری نعمتیں اُسی کے ہاتھ میں ہیں:

وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۔ (النحل: ۵۳)

ترجمہ: تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے، اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اِس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حق کو ادا کرنے میں سُستی سے کام لے یا اُس سے غفلت برتے۔

اللہ تعالیٰ کے روزانہ کے حقوق میں سب سے نمایاں حق نماز ہے جس میں خشوع کو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اولین صفت قرار دیا ہے:

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۔ (المومنون: ۲)

ترجمہ: جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

اور نماز کی محافظت کو اُن کا آخری وصف قرار دیا:

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۔

(المومنون: ۹)

ترجمہ: جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کی ہلاکت و بربادی کا فیصلہ فرمایا ہے جو نماز سے اس حد تک غافل ہو کہ اس کا معلوم و متعین وقت فوت ہو جائے:

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ۔

(الماعون: ۴، ۵)

ترجمہ: پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔

اللہ کے بعد سب سے بڑا حق اِنسان پر اُس کے والدین کا ہے، اِسی لیے قرآن میں توحید اور اللہ کی بندگیِ خالص کے معاً بعد اُن کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذکر آیا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ

(بنی اسرائیل: ۲۳)

ترجمہ: تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ، تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

قرآن و سنّت نے ماں کے حق کو خاص طور پر اہمیت دی ہے، اس لیے کہ اس کا حق قطعی ہے اور وہ رعایت کی زیادہ محتاج ہے اور بچّے کی پرورش میں اس کی مشقّتیں بھی زیادہ ہیں:

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ

(احقاف: ۱۵)

ترجمہ: اُس کی ماں نے مشقّت اٹھا کر اُسے پیٹ میں رکھا اور مشقّت اُٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دُودھ چھُڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔

ماں کے لیے سال میں ایک دن خاص کر لینا جسے لوگ عید الأم کا نام دیتے

ہیں، اسلام کی نگاہ میں نہ تو کافی ہے اور نہ وہ اُسے پسند کرتا ہے، بلکہ اِسلام یہ چاہتا ہے کہ ماں کے سب دن عید ہوں۔

اِس کے بعد قرابت داروں — بھائی بہنوں، چچا چچیاں، پھوپھا پھوپھیاں، ماموں ممانیاں اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں — کے حقوق آتے ہیں، اور ان کے علاوہ جو رحمی رشتہ دار ہیں ان کے بھی حقوق ہیں۔

اِسی طرح معاشرے کے کمزور لوگوں — یتیموں، مسکینوں اور مسافروں — کے بھی حقوق ہیں۔ اور میل جول کے لوگوں یعنی رشتہ دار پڑوسیوں یا دُور کے پڑوسیوں کا بھی حق ہے اور اُس ساتھی کا بھی حق ہے جو سفر و حضر میں انسان کے ساتھ رہتا ہے، خواہ یہ رفاقت عارضی ہو یا دائمی۔ اور حقوق الزوجین بھی اِسی ضمن میں آتے ہیں۔

اور آخری حق مِلکِ یمین (وہ لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہوں) کا ہے۔ گرچہ اس کا تعلق غلامی کے زمانے میں غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک سے ہے، لیکن اس لفظ کے عموم میں وہ سارے حیوانات، سامان، آلات اور دیگر چیزیں شامل ہیں جو انسان کے ماتحت ہیں۔ اور وہ ان اشیاء کے ساتھ حسنِ سلوک کا پابند ہے، بایں طور کہ وہ اُن کی نگرانی و حفاظت کرے اور ان کی بھرپُور رعایت کرے اور انھیں برباد نہ ہونے دے، اس لیے کہ وہ اُن چیزوں کا امین ہے۔

مسلمان جب سونے کا ارادہ کرے تو اُس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے، پھر اپنے بستر پر دائیں پہلو لیٹ جائے اور سونے کے وقت کے جو اذکار ہیں ان کا ورد کرے، مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ہے:

"بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ، وَبِكَ اَرْفَعُهُ۔ إِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لَهَا، وَإِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ

عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ۔

ترجمہ: اے میرے پروردگار! تیرے نام سے میں نے اپنے پہلو کو بستر پر رکھا، اور تیرے ہی نام سے اُٹھاؤں گا۔ اگر تُو میرے نفس کو اپنے پاس روک لے تو اُس کی مغفرت فرما، اور اگر تُو اسے واپس دنیا میں آنے کے لیے چھوڑ دے تو اس کی حفاظت اس طرح فرما جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔

مسلمان کو چاہیے کہ اُن کتابوں سے استفادہ کرے جو ہمارے علماء نے صبح وشام کے دینی اعمال ومشاغل سے متعلق لکھی ہیں، اس سلسلے کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

امام نسائیؒ کی "عمل الیوم واللیلۃ"، اور حافظ ابن السنیؒ کی بھی ایک کتاب اِسی نام سے ہے۔ امام نوویؒ کی کتاب "الاذکار"، امام ابن تیمیہؒ کی کتاب "الکلم الطیب"، اور ان کے شاگرد ابن القیمؒ کی کتاب "الوابل الصیب"، اور "الحصن الحصین"، "تحفۃ الذاکرین"، اور حسن البناؒ کی "ماثورات"۔

انسان کا وقت ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان

وقت — زمانہ — کی تین قسمیں ہیں:۔ ماضی، حال اور مستقبل — اور ان سے تعلق رکھنے والوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور عام طور سے لوگ اس سلسلے میں بھی افراط وتفریط کا شکار ملتے ہیں مثلاً: کوئی ماضی کا بندہ وغلام ہے تو کوئی حال کا اسیر — اور کوئی مستقبل کا حامی وعلم بردار ہے۔ بلاشبہ کچھ ایسے معتدل ومتوازن قسم کے لوگ بھی ہیں جو ماضی، حال ومستقبل تینوں کا حق ادا کرتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔

ماضی کے غلام

جو لوگ ماضی کے شیدائی ہیں ان کے سامنے کسی دوسرے زمانے کی کوئی
بیت نہیں ہے، وہ صرف یادِ ماضی میں کھوئے رہتے ہیں، خواہ یہ ان کا ماضی
فضی صورت میں ہو — جیسے بھٹکے ہوئے عاشقوں کا ماضی — خواہ خاندان اور آبا و
جداد کی شکل میں — یہ وہ لوگ ہیں جو حسب ونسب اور ماضی کی یادوں کے
سلسلے میں انتہائی غلو سے کام لیتے ہیں۔

اضی کے غلاموں کی یہ قسم متعدد صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے

الف — ایک صورت ان لوگوں کی ہے جو محض ماضی کے کارناموں اور
ں کے مفاخر کے تذکروں سے زندہ رہتے ہیں، ان میں کسی قسم کا اضافہ نہیں
رتے۔ وہ اپنے کو ماضی سے وابستہ رکھتے ہیں، اور آج کو گزرے ہوئے کل
سے جوڑے رکھتے ہیں، اور ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہم یہ تھے اور ہمارے آبا و
جداد یہ اور وہ تھے۔ اُن کے پاس اِن باتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسی قسم
ے لوگوں کے سلسلے میں عربی کے مشہور شاعر متنبّی نے کہا ہے:

لَئِنْ فَخَرْتَ بِآبَاءٍ ذَوِي حَسَبٍ
لَقَدْ صَدَقْتَ، وَلَكِنْ بِئْسَ مَا وَلَدُوا

ترجمہ: اگر تم نے اپنے عالی نسب آباء و اجداد پر فخر کیا تو درست کیا،
لیکن انہوں نے تمہاری شکل میں کتنی بُری اولاد جنی —؟

بلاشبہ آباء و اجداد کے آثار اور ماضی کے کارناموں پر فخر کرنا ایک
پسندیدہ فعل ہے، مگر اُس وقت جب کہ یہ اُن کارناموں کی تکمیل کا محرک ہو

جن کا آغاز آباء و اجداد نے کیا تھا۔ ورنہ صرف ان کارناموں کے گُن گانے پر اکتفا کرنا ایک سلبی رُخ ہے، جس کا اُمتوں کی تعمیر میں کوئی کردار نہیں ہے۔

اور حق یہ ہے کہ وہ بوسیدہ ہڈی کس کام کی ہوگی جو کہے کہ میں گزرے ہوئے دنوں میں ایک زندہ جسم تھی۔ اور ماضی کے تعلق سے ایجابی موقف وہ ہے جس کی تعبیر عربی کے ایک شاعر نے اپنے شعر میں اس طرح کی ہے:

إِنَّا وَإِنْ كَرُمَتْ أَوَائِلُنَا
لَسْنَا عَلَى الْآبَاءِ نَتَّكِلُ
نَبْنِيْ كَمَا كَانَتْ أَوَائِلُنَا
نَبْنِيْ وَ نَفْعَلُ مِثْلَ مَا فَعَلُوْا

ترجمہ: ہمارے پیش رو گرچہ عزّت و بزرگی والے تھے، لیکن ہم آباء و اجداد پر تکیہ کرنے والے نہیں ہیں۔ ہم تعمیر کریں گے جس طرح کہ ہمارے پیش رو تعمیر کرتے تھے، اور اُنھیں کی طرح کارنامے بھی انجام دیں گے۔

ب۔ تُراث (ماضی کا ورثہ) کے حاملین کی صورت بھی پہلی ہی صورت سے ملتی جلتی ہے، جن کا دعویٰ ہے کہ ماضی سے ہمیں جو کچھ بھی ورثے میں ملا ہے وہ سب کا سب مقدس ہے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ۔ اُن کا خیال ہے کہ ماضی ہمیشہ حال سے بہتر ہوتا ہے، اور اگلوں نے بعد کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا ہے، اور جو کچھ وہ کر گزرے ہیں اس سے زیادہ کرنا اب ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہاں تُراث کے مفہوم کی تجدید اور اس کے بعد اس کی تقویم ضروری ہے۔

ہمارے کچھ مسلمان لوگ قرآن و سنّت کو بھی تُراث کے مفہوم میں شامل

کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کے التزام میں ایمانی معاہدے کی رُو سے ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ط

(احزاب : ۳۶)

ترجمہ: کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنّت کو مقدس ماننا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، اس لیے تراث کے اِس الٰہی پہلو میں ہمارے لیے اختیار و تردّد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہاں رہا تراث کا بشری پہلو تو اُسے لازماً پرکھا جائے گا اور کھرا، کھوٹا، قابلِ قبول اور ناقابلِ قبول چیزوں میں فرق کیا جائے گا۔ انسانی تُراث میں کچھ کی حیثیت مقامی ہوتی ہے عالمی نہیں، اور اس پر اس جگہ کی چھاپ ہوتی ہے جہاں وہ نمودار ہوتی ہے، اس لیے وہ دُوسری جگہ کے لیے مناسب نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض چیزوں پر اپنے خاص زمانے کی چھاپ ہوتی ہے اور وہ دُوسرے زمانے کے لیے بے کار ہیں۔

ج۔ اور ایک صورت ان لوگوں کی ہے جو ماضی میں جی رہے ہیں، اور اُسے اپنے سینے سے چمٹائے ہوتے ہیں، اس کا قلادہ اپنے گلے میں لٹکائے ہوئے ہیں کیوں کہ اُن کے آباء و اجداد بھی اسی طریقے پر گامزن تھے۔ وہ اس بات کی ضرورت قطعی نہیں محسوس کرتے کہ اس ماضی کو جانچ پرکھ کر دیکھیں

کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، اور کیا گمراہی ہے اور کیا ہدایت۔
اسی طرح کے لوگوں کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۷۰)

ترجمہ: اور اُن سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھیں کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟

اور تقلیدِ آباء کی اِسی فکر نے قدیم زمانے سے انبیاء کے سامنے سب سے بڑی رُکاوٹ کھڑی کی، چنانچہ قومِ ہود نے اُن سے کہا:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ (اعراف : ۷۰)

ترجمہ: کیا تو ہمارے پاس اِس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور اُنھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟

اور قومِ ثمود نے صالح علیہ السلام سے کہا:

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ (ہود : ۶۲)

ترجمہ: اے صالح، اِس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

اِسی طرح جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (انبیاء: ٥٢، ٥٣)

ترجمہ: "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟" تو اُنھوں نے جواب دیا "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔"

اور شعیب علیہ السلام کی قوم نے اُن سے کہا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ۔ (ہود: ٨٧)

ترجمہ: اے شعیب، کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اُن سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش باپ دادا کرتے تھے؟

قرآن نے باطل پرستوں کی اِس سنت کو اس طرح ثابت کیا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (زخرف: ٢٣)

ترجمہ: اِسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی

اپنے ماضی پر اظہارِ ندامت کرتے رہتے اور گزرے ہوئے لمحات پر کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں۔ اُن کی زبان پر ہمیشہ حسرت و آرزو کے الفاظ جاری رہتے ہیں: کاش کہ میں نے کیا ہوتا، اور کاش میں نے نہ کیا ہوتا، اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا، اور اگر میں نے اِس کو پہلے کیا ہوتا اور اُس کو بعد میں کرتا تو ایسا اور ایسا ہوتا۔

اِس طرح کا شعور اور فکر انسان کو ہمیشہ نفسیاتی غم کے شکنجے میں جکڑے رہتی ہے، اور ایسی بے چینی کے عالم میں اُسے زندہ رکھتی ہے جس کا نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ کوئی فائدہ۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ گزرے وقت کے رائیگاں جانے کی فکر میں پڑنا آنے والے وقت کو ضائع کرنا ہے۔

قرآن و سنّت نے بھی اس طرزِ فکر کی مذمت کی ہے، چناں چہ جب غزوۂ اُحُد میں مسلمانوں کو کچھ چوٹیں آئیں تو اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (آل عمران: ۱۵۶)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثے سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اِس

قسم کی باتوں کو اُن کے دلوں میں حسرت واندوہ کا سبب بنا دیتا ہے، ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔

اور رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طاقت ور مومن بہتر ہے اور اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے زیادہ پسندیدہ ہے، ویسے مجموعی طور پر بھلائی ہر ایک میں ہے، تم اُن چیزوں کے حریص بنو جو تمہارے لیے نفع بخش ہوں اور اللہ سے مدد طلب کرو تو کبھی حصولِ مقصد میں عاجز نہیں رہوگے، اور یہ نہ کہو کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا، بلکہ یہ کہو کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اُس نے جو چاہا کیا۔ اس لیے کہ لفظِ 'لو' (اگر) شیطانی عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔" (رواہ مسلم عن أبی ہریرۃ)

اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر ایمان انسان کے اندر ایک ایسا مؤثر عامل داخل کر دیتا ہے جو "اگر" اور "کاش" کی سلبیت کو نکال باہر کرتا ہے، اور اُسے مستقبل کے لیے مثبت عمل اور تعمیر پر اُبھارتا ہے۔

مستقبل کے پجاری

ماضی کے ان پرستاروں کے بالمقابل کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو غلو کی حد تک مستقبل سے چمٹے ہوئے اور ماضی سے لاتعلق ہیں۔ اُنھیں اپنی اور انسانیت کی تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ وہ لوگ حق و باطل، حرام و حلال اور مفید و مُضر میں کسی فرق و تمیز کے بغیر ثقافتی، دینی اور تہذیبی سرمائے کا مکمل انکار کرتے ہیں۔

نذیر بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنھیں کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔

قرآن نے اس طرح کے لوگوں کی سخت مذمت کی ہے، اور اس عقلی جمود، آبا پرستی اور موروثی روایات کی اندھی تقلید کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اور ان لوگوں کی فہمائش اِن الفاظ میں کی ہے:

اَوَلَوْكَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(البقرہ: ۱۷۰)

ترجمہ: اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ اُنھیں کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟

اَوَلَوْكَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔

(المائدہ: ۱۰۴)

ترجمہ: کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی اُنھیں خبر ہی نہ ہو؟

قٰلَ اَوَلَوْجِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ط

(زخرف: ۲۴)

ترجمہ: ہر نبی نے اُن سے پوچھا، کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمھیں اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟

د ــ ماضی میں جینے والوں میں ایک تصویر اُن لوگوں کی ہے جو ہمیشہ

اُن کا کہنا ہے کہ ہمیں ان آباء واجداد سے کیا واسطہ جو مر گئے۔ ہمیں تو اُن نوجوانوں کی تلاش ہے جو کل کے مرد ہوں گے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہماری آنکھیں ہماری گدّیوں میں نہیں بنائی گئی ہیں کہ ہم پیچھے مڑکر دیکھیں، بلکہ ہمارے چہروں پر ہیں تاکہ ہم آگے کی طرف دیکھیں۔ آخر تم لوگ کیوں ہمیں پیچھے دکھانا چاہتے ہو، یہی چیز ہمارے لیے منزلِ مقصود کی طرف تیزی سے بڑھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

لیکن یہ بات اُس وقت نہ صرف یہ کہ حق نہیں ہوگی بلکہ اس حق کے ذریعے باطل مقصود ہوگا، جب اس کا مقصد یہ ہو کہ ماضی کو بالکل فراموش کر دیا جائے، قومی سرمائے کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے، اور تاریخ کو ملیامیٹ کر دیا جائے — حالانکہ تاریخ میں بے شمار سبق آموز اور عبرت انگیز واقعات موجود ہوتے ہیں جن سے عقل وشعور کو — رہنمائی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں ماضی اور اُس کے عبرت آموز واقعات سے استفادہ پر زور دیتے ہوئے کتنی سچّی بات فرمائی ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج: ۴۶)

ترجمہ: کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور ان کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

مستقبل کا سلبی نقطۂ نظر: بدشگونی اور مایوسی کا نظریہ

بعض لوگ مستقبل کے سلسلے میں سخت مایوسی اور بدشگونی کا شکار ہیں۔ اُنھوں نے

اپنی آنکھوں پر سیاہ عینکیں چڑھا رکھی ہیں جس کے ذریعے انھیں زندگی اور زندوں میں، زمان و مکان کے ہر گوشے میں مایوسی و نااُمیدی کے گہرے سائے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کو نہ مستقبل پر اعتماد ہے اور نہ اس میں کامیابی کی کوئی کرن ہی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ معاملات ہمیشہ بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین ہی کی طرف چلتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی ایک ایسی رات ہے جس کی کوئی صبح نہیں اور اس کی تاریکیوں کو دُور کرنے والا کوئی سُورج نہیں ہے۔

یہ بلاشبہ ایک ایسا تباہ کن نظریہ ہے جو انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوسی کے غار میں دھکیل دیتا ہے، اور نتیجتہً فرد اور معاشرہ دونوں تباہ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ جس معاشرے کے افراد پر مایوسی طاری ہو اُس میں ترقی اور زندگی کے آثار کہاں سے نظر آئیں گے۔

فرد کی زندگی میں اگر اُمید کی کرن نہ ہو تو وہ انگوٹھی کے حلقے سے زیادہ تنگ ہوجاتی ہے۔ اسی لیے ایک قدیم شاعر کہتا ہے:

مَا أَضْيَقَ الْعَيْشِ لَوْلَا فُسْحَةُ الْأَمَلِ!

ترجمہ: اگر کشادگیٔ اُمید نہ ہوتی تو زندگی کس قدر تنگ ہوجاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب، تاریخ اور واقعات سب کے سب ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی میں مایوسی کا کوئی تصوّر نہیں، اُسی طرح مایوسی کے ساتھ زندگی کا کوئی تصوّر نہیں ہے — انھیں چیزوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ دُنیا میں کسی حال کا ہمیشہ باقی رہنا ایک امرِ محال ہے — یہاں دشواری کے ساتھ آسانی ہے اور تاریکیٔ شب کے ساتھ سپیدۂ سحری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّہٗ لَا یَایۡئَسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ۔

(یوسف : ۸۷)

ترجمہ: اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

قَالَ وَمَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ○

(الحجر: ۵۶)

ترجمہ: اور اپنے رب کی رحمت سے تو مایوس گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔

یاس کی صورتوں اور بدشگونی کے مظاہر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ یہ مان کر چلتے ہیں کہ ہم آج آخری زمانے میں ہیں اور قیامت کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں۔ بھلائیاں مٹ رہی ہیں، بُرائیاں پروان چڑھ رہی ہیں۔ دین داری کا چراغ روز بروز ماند پڑتا جا رہا ہے کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ کفر زمین پر عام ہوتا جا رہا ہے اور قیامت بھی کافروں ہی پر قائم ہوگی۔ اس لیے اب موجودہ صورت حال میں نہ علاج سے کوئی فائدہ ہے اور نہ اصلاح کی کوئی توقع۔

وہ لوگ اِس مایوس کن نظریے کے لیے اُن احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو فتنوں اور قیامت کی علامتوں کے باب میں وارد ہوئی ہیں۔

حالاں کہ معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ اِن لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ جو نصُوص قربِ قیامت یا اُس کی علامتوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، اُن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دروازے پر آ لگی ہیں۔ قُرب یا بُعد ایک نسبتی امر ہے اِس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے تصوّر سے

بھی زیادہ قریب ہو۔ قرآن نے صرف اتنا کہا ہے:

لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝ ——— (احزاب : ۶۳)

ترجمہ: شاید کہ قیامت قریب آلگی ہو۔

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ۔ ——— (شوریٰ : ۱۷)

ترجمہ: شاید کہ قیامت قریب ہو۔

ایک دُوسری جگہ فرمایا:

لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً۔ ——— (اعراف : ۱۸۷)

ترجمہ: وہ تم پر اچانک آجائے گی۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی قیامت کی علامتوں میں سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"میں اور قیامت ان دونوں کی طرح بھیجے گئے ہیں ... اور پھر آپؐ نے اپنی انگشتِ شہادت اور بیچ کی اُنگلی کو ایک دوسرے سے ملا کر اشارہ فرمایا۔" (بخاری و مسلم)

قیامت کے انتظار میں شریعتِ اسلامی، اُمتِ مسلمہ اور اسلامی حکومت کے احیاء کے عمل سے غافل ہو کر بیٹھ رہنا اور یہ سمجھ لینا کہ ہم تو آخری زمانے میں ہیں، ایک ایسی روش ہے جسے دینِ اسلام سخت ناپسند کرتا ہے ——— مسلمان بحیثیت فرد کے عمل و جہاد پر مامور ہے جب تک وہ زندہ ہے۔ اور سارے مسلمان بحیثیت اُمت اِسی کام پر مامور ہیں تا وقتیکہ توبہ کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ اور ایسا دُنیا کی عمر کے آخری ایام میں ہوگا، جب اِس دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور سُورج بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوگا:

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ

تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا۔

(انعام : ۱۵۸)

ترجمہ: جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے دنیوی عمل کو آخری سانس تک جاری رکھنے کا حکم دیا ہے، وہ عمل خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

"اگر قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو اور اُسے اپنی جگہ سے اُٹھنے سے پہلے لگا سکتا ہے تو لگا دے"۔

(رواہ احمدؒ والبخاریؒ فی الادب المفرد)

جب مسلمان کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ صور کی آواز سننے کے بعد بھی پودا لگانا نہ چھوڑے اور ممکن حد تک اپنے کام کو پورا کرے، حالاں کہ اس پودا لگانے کا فائدہ نہ اُسے ہوگا اور نہ اُس کے بعد دوسرے کسی کو ہوگا، تو پھر ہم مایوس ہو کر عمل کرنا کیوں چھوڑ دیں جب کہ ہمارے اور قیامت کے درمیان نامعلوم مدتیں ہیں جن کی میعاد کا علم خالقِ کائنات کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔

عمل بذاتِ خود مطلوب ہے، خواہ صاحبِ عمل کو اس کا کوئی فوری فائدہ نہ حاصل ہو ــــ اگر عمل کے ساتھ اس کا ثمرہ بھی مل گیا تو گویا وہ دوہری کامیابی سے ہم کنار ہو گیا، اور اگر ایسا نہ ہوا تو اُس کے لیے یہی کافی ہے کہ اُس نے سعی و عمل میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور اپنی ذمہ داری ادا کر کے اللہ کے نزدیک معذور ہو گیا۔ اور مخالفین پر بھی حجت قائم کر دی جن کا کوئی عذر اللہ تعالیٰ کے یہاں

مقبول نہ ہوگا۔

ہم اس سلسلے میں بعض احادیث نقل کر رہے ہیں جن سے بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

۱۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد ایسے فتنے سر اُٹھائیں گے جو تاریک رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے۔ (یہ سُن کر) میں نے عرض کیا: یا رسُول اللہ! پھر اُن سے نجات پانے کا طریقہ کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی کتاب، (یعنی اللہ کی کتاب کو اگر تم پکڑے رہو گے اور اس پر عمل پیرا ہو گے تو تم ان فتنوں سے نجات پا سکتے ہو) اس لیے کہ اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی ہیں اور اُن باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے جو تمہارے بعد پیش آنے والی ہیں (یعنی قیامت کی نشانیاں اور اُس وقت کے پُرفتن حالات) اور اس میں وہ احکام بھی بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق تمہارے معاملات سے ہے۔"

۲۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اعمالِ صالحہ میں جلدی کرو، کیوں کہ عنقریب ایسے فتنے سر اُٹھانے والے ہیں جو تاریک رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے۔ (اور اُن فتنوں کا اثر یہ ہوگا کہ) آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اُٹھے گا اور شام کو کافر بن جائے گا، اور شام کو مومن ہوگا تو صبح کفر کی حالت میں بدل چکا ہوگا، اور اپنے دین و مذہب کو دنیا کی متاعِ حقیر کے عوض بیچ ڈالے گا۔" (رواہ مسلم)

۳۔ حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام ابنِ ماجہ رحمہم اللہ نے اپنی اپنی سنن میں نقل فرمائی ہے جس میں ابوثعلبہؓ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ارشادات و فرامین کے ساتھ یہ ارشاد بھی ذکر فرمایا ہے کہ: تمہارے بعد (آخری زمانے میں) ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا ضروری ہوگا،

اور اُن ایّام میں صبر کرنا ہاتھ میں انگارا پکڑنے کے مانند ہوگا، اور ان دنوں میں جو شخص دین و شریعت کے احکام پر عمل کرے گا اس کو اُن پچاس لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا جو اس شخص جیسے عمل کریں۔ حضرت ابو ثعلبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے (تعجب سے) پوچھا کہ ایک شخص کو اُن کے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ملے گا!! تو آپؐ نے فرمایا: (بلکہ) تمہارے پچاس آدمیوں کے برابر۔

بعض دُوسری روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول کے ذریعے اِس اجر کو دوچند کرنے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم خیر اور بھلائی کے کاموں میں بہت سے ساتھی اور مددگار پاتے ہو، اور اُن کو خیر اور بھلائی کے کام میں کوئی اور ساتھی اور مددگار نہیں ملے گا۔“

۴۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ دونوں نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ”لوگ تو (اکثر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر، بھلائی اور نیکی کے بارے میں پُوچھا کرتے تھے اور میں آپؐ سے شر اور بُرائی کے بارے میں دریافت کیا کرتا تھا، اِس ڈر سے کہ کہیں میں اُس میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ (ایک دن اپنی مذکورہ عادت کے مطابق) میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم لوگ (اسلام سے قبل) جاہلیت اور بُرائی میں مبتلا تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت اور بھلائی (اسلام کی روشنی) عطا فرمائی تو کیا اس ہدایت اور بھلائی کے بعد اور کوئی بُرائی پیش آنے والی ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”ہاں!“ میں نے عرض کیا تو کیا اُس بُرائی کے بعد پھر ہدایت اور بھلائی کا ظہور ہوگا تو آپؐ نے فرمایا: ”ہاں! لیکن اس بُرائی کے بعد جو بھلائی آئے گی اُس میں دُھواں یعنی کدورت ہوگی۔ میں نے دریافت کیا کہ اس بھلائی کی کدورت کیا ہوگی؟ ارشاد فرمایا: (اس سے مراد یہ ہے کہ) ایسے لوگ

پیدا ہوں گے جو میرے طریقے اور میری روش کے خلاف طریقہ اور روش اختیار کریں گے۔ لوگوں کو میرے بتائے ہوئے راستے کے خلاف چلائیں گے۔ اُن کی کوئی بات اچھی (شرع کے مطابق) ہو گی اور کوئی بُری (خلاف شرع)۔ میں نے عرض کیا "کیا اس بھلائی کے بعد پھر کوئی بُرائی پیش آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو (اپنی طرف) بلائیں گے، جو شخص اُن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے دوزخ کی طرف جانا چاہے گا اس کو وہ دوزخ میں دھکیل دیں گے۔ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! اُن لوگوں کی صفت بیان فرمائیے (تاکہ ہم اُن کو پہچان لیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ ہماری قوم (ہمارے ابنائے جنس اور ہماری ملّت کے لوگوں) میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں گفتگو کریں گے۔"

دیکھا آپ نے کہ یہ احادیث کس طرح شر سے ہوشیار کر رہی ہیں اور خیر کی ترغیب دے رہی ہیں، حق پر جمنے کی تاکید کر رہی ہیں، کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے پکڑنے پر اُبھار رہی ہیں، اللہ کی اطاعت پر صبر اور اس کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے پر زور دے رہی ہیں اور ان داعیانِ شر کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کر رہی ہیں جو جہنّم کے دروازے پر کھڑے ہیں، جو اُن کی دعوت پر لبیک کہے گا اس کو وہ اس میں پھینک دیں گے۔

جس طرح یاس و قنوط کا نظریہ مستقبل کا ایک سلبی موقف ہے، اسی طرح مستقبل کا ایک دوسرا سلبی موقف یہ بھی ہے کہ آدمی مستقبل کا سامنا علم و عمل کی تیاری اور مضبوط منصوبہ بندی کے بجائے محض آرزوؤں اور خوابوں کے ذریعے کرے۔ حالاں کہ آرزوؤں سے نہ کسی کو کوئی عزّ و شرف ملا ہے، اور نہ کسی کی کوئی اُمید بر آئی ہے، بلکہ کعب بن زہیر کے بقول "آرزوئیں اور خواب گمراہی کا ذریعہ ہیں۔"

ایک شخص نے ابن سیرینؒ سے کہا: "میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں بغیر پانی کے

تیر رہا ہوں اور بے پَر کے اُڑ رہا ہوں ، یہ خواب سُن کر اُنھوں نے فرمایا : تم آرزؤوں اور خوابوں کی جنّت میں رہنے والے آدمی ہو۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا : خبردار! آرزؤوں پر کبھی بھروسا نہ کرنا ، یہ بے وقوفوں کا سرمایہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی صرف اسی لیے مذمّت کی ہے کہ انھوں نے ایمان و عمل کے ضروری اسباب کے بغیر جنّت میں داخلے کی آرزو اپنے دل میں بٹھالی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا :

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ : ۱۱۱-۱۱۲)

ترجمہ : اُن کا کہنا ہے کہ کوئی جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ اُن کی تمنّائیں ہیں۔ اِن سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیت ہے ، نہ کسی اور کی حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے ، اُس کے لیے اُس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اور قرآن نے اس سلسلہ میں صرف اہلِ کتاب کی مذمّت کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے ساتھ ان مسلمانوں کو بھی شریک کیا ہے جو اُن کے نقشِ قدم پر چلیں اور گمان کرلیں کہ صرف اسلامی نام یا اسلام سے نسبت اللہ کے نزدیک نجات کے لیے کافی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (النساء: ۱۲۳-۱۲۴)

ترجمہ: انجامِ کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی بُرائی کرے گا اُس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

بلاشبہ قرآن نے آرزوؤں پر اعتماد کی شدید مذمّت کی ہے، مگر وہ اُمید و رجاء کا مخالف نہیں ہے اور اُس نے ان دونوں چیزوں کے درمیان فرق کیا ہے، اُمید کا سررشتہ ہمیشہ عمل سے جُڑا ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جو ہے وہ سب آرزو ہے۔

حدیثِ نبویؐ نے بھی اللہ کی صفتِ عفو و مغفرت اور وسعتِ رحمت پر تکیہ کرکے خواہشوں کے پیچھے بھاگنے اور نفس کی پیروی کرنے کو حماقت اور درماندگی

سے تعبیر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (اعراف:۵۶)

ترجمہ : بلاشبہ اللہ کی رحمت "نیکو کاروں" سے قریب ہے ۔

ایک دُوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (اعراف : ۱۵۶)

ترجمہ : میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، اور اُسے میں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے ۔

رجاء (اُمید) اوراہلِ رجاء کی تعریف و توصیف قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لا اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۱۸)

ترجمہ : جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے، وہ رحمتِ الٰہی کے جائز اُمیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے ۔

بعض صالحین کا قول ہے کہ بغیر عمل کے جنّت کی طلب گناہ ہے، اتباعِ سنّت کے بغیر شفاعت کی اُمید سراسر دھوکا ہے اور گناہ کے باوجود اللہ کی رحمت کی اُمید رکھنا حماقت اور جہالت ہے ۔

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ :

"کچھ لوگوں کو مغفرت کی آرزو نے اس طرح غافل کر رکھا ہے کہ وہ دُنیا سے اس حال میں گئے کہ اُن کے پاس کوئی نیکی نہیں تھی۔ اُن میں ایک کہتا ہے کہ مجھے اپنے رب سے خوش گمانی ہے، حالاں کہ اس نے جھوٹ کہا، اگر وہ واقعی اپنے رب کے ساتھ اچھا گمان رکھتا تو اس کے لیے عمل بھی اچھا کرتا۔"

پھر اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کا قول تلاوت فرمایا:

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخٰسِرِينَ۔

(حٰم سجدة : ۲۳)

ترجمہ: تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔

حسن بصریؒ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اے لوگو! ان آرزوؤں سے ہوشیار رہو، اس لیے کہ یہ احمقوں کی وادیاں ہیں اور وہ اُسی میں اُتارے جائیں گے۔ بخدا اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو آرزو کے ذریعے نہ دنیا میں کوئی بھلائی دی اور نہ آخرت میں کوئی بھلائی دے گا۔

وقتِ حاضر کے دِل دادہ

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ ماضی پر نظر رکھتے ہیں اور نہ مستقبل کی آرزو کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے آج کے دن سے مطلب رکھتے ہیں۔ اور اُسی آج کے لیے جیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ماضی گزر گیا اور جو گزر گیا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور جو چیز فنا کے گھاٹ اُتر گئی اس کے بارے میں اپنے ذہن و دماغ کو مشغول رکھنے اور اس کے متعلق سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح مستقبل اُن کے نزدیک غیب ہے اور غیب مجہول و نامعلوم شے ہے۔ اس لیے ان کے خیال میں واقعیّت پسند انسان کو نامعلوم شے سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے، اِس لیے کہ اس سے واسطہ رکھنا ریت پر مکان بنانے اور ہَوا میں لکھنے کے مانند ہے۔

اِن لوگوں کو ان کے حال کی رنگینیوں نے اس قدر غافل کر دیا ہے کہ انھیں نہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہے اور نہ اپنے ماضی سے استفادہ کی پروا۔

وہ لوگ صرف ابن الوقت ہیں، وہ آخرت کی فکر نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ بھی مستقبل ہے۔ وہ لوگ نقد کو اُدھار سے اور عاجل کو آجل سے نہیں بیچتے۔ اُنھیں تاریخ اور قومی سرمائے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ گزرے ہوئے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اور ان کے ابن الوقت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ صرف موجودہ لمحات کی فکر کرتے ہیں اور انھیں کا اہتمام کرتے ہیں اور خوب دادِ عیش دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے ذکر اور مستقبل کی فکر سے اپنی زندگی کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

جب انسان کا اپنا وقت صرف وہی ہے جس میں وہ موجود ہے تو پھر کیوں وہ اسے برباد کرتا ہے؟ اور کیوں نہیں اُسے اللہ کی اطاعت میں لگاتا ہے؟ اور اس وقت کا استعمال نصرتِ حق، عملِ خیر اور بھلائی کی اشاعت کے کاموں میں کیوں نہیں کرتا؟

اور حق یہ ہے کہ اگر حاضر کا تجزیہ اور اس پر غور و فکر کیا جائے تو اُس کی حیثیت ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک خیالی خط کی ہے۔ اِسی بنیاد پر بعض شعراء کہتے ہیں ؎

مَا الدَّهْرُ اِلَّا سَاعَتَانِ : تَأَمُّلُ
فِيْمَا مَضٰى وَ تَفَكُّرٌ فِيْمَا بَقِيَ

ترجمہ: زمانہ عبارت ہے دو وقتوں سے : ماضی جو غور و فکر کا طالب ہے اور مستقبل جو منصوبہ بندی کا طالب ہے۔

اِس شاعر نے حال کا تصور ہی ختم کردیا، لیکن اُسے جاننا چاہیے کہ عرفِ عام میں حاضر (حال) وہ موجودہ لمحہ ہوتا ہے جو مستقبل کے قریبی جزء سے بالکل متّصل ہوتا ہے، اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ گویا وہ بالفعل حاضر ہوگیا ہے۔

زمانے سے متعلق صحیح نقطۂ نظر

زمانے سے متعلق اسلام کا ہی نقطۂ نظر ماضی، حال اور مستقبل سب کی بھرپور رعایت کرتا ہے۔ یہ ہمہ گیری یا ہمہ جہتی اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہب یا دھرم میں نہیں ملے گی۔

تصوّرِ ماضی کی ضرورت

ماضی کا تصور اس لیے ضروری ہے کہ اس کے حوادث و واقعات میں اور اس میں گزری ہوئی قوموں کے انجام میں سامانِ عبرت و نصیحت ہے۔ اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماضی ہمارے لیے خزانۂ عبرت و نصیحت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ (آلِ عمران: ۱۳۷-۱۳۸)

ترجمہ: تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو
کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو)
جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہہ ہے اور جو اللہ
سے ڈرتے ہوں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

پھر اسی سورہ میں ایک آیت کے بعد ارشاد ہوا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ
الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

(آل عمران : ۱۴۰)

ترجمہ: اِس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ
تمہارے فریقِ مخالف کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و
فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

پانچ آیتوں کے بعد ارشاد فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا
وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا
اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔

(آل عمران : ۱۴۶)

ترجمہ: اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ
مل کر بہت سے خُدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں
اُن پر پڑیں اُن سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کمزوری
نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی
صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا :

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔ (الحج : ۴۶)

ترجمہ: کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور ان کے کان سننے والے ہوتے ؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

پھر اس پہلو سے بھی ماضی کی اہمیت ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے آنے والی نسلوں کے لیے جو علوم وفنون چھوڑے ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے : اور اُن میں سے جو کچھ ہمارے زمانے اور احوال کے مطابق ہو اُسے اختیار کیا جائے۔

اور ہر قدیم چیز کو محض اس بنیاد پر چھوڑ دینا کہ وہ قدیم ہے درست نہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قدیم تو سمجھی جاتی ہیں، لیکن پھر بھی اُن کی کچھ نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں اور وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تجدید کو قبول نہیں کرتیں۔ کیا قرآن کی یہ خصوصیت نہیں ہے کہ وہ کلام ہے اور ایک طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود نہ تو اس کے نئے پن میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ اس پر قدامت کا ہی کوئی اثر ہے ؟

کیا کعبۃ اللہ کی یہ خصوصیت وفضیلت نہیں ہے کہ وہ "قدیم گھر" ہے، مگر صدیوں سے لوگ مسلسل اُس کا قصد کرتے ہیں۔ بلاشبہ نہ قرآن کی تجدید ہوگی اور نہ کعبۃ اللہ کی، اس لیے کہ حقائق کی تجدید نہیں ہوتی۔

تجدید کے حامیوں نے ہر قدیم چیز سے اعراض اور ہر نئی چیز کی تائید کرکے بڑی زیادتی کی ہے۔ حالاں کہ بعض قدیم چیزیں عظیم تر فوائد کی حامل ہوتی ہیں، اور بعض نئی چیزیں بڑے نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔ عربی کے مشہور اسلام پسند ادیب

مصطفیٰ صادق الرافعی ان مجدّدین کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

" یہ لوگ دین ، زبان ، سُورج اور چاند سب کی تجدید چاہتے ہیں "

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قدیم و جدید دونوں نسبتی امر ہیں - ایک چیز جو کچھ لوگوں کے نزدیک قدیم ہے ، وہی دوسروں کے لیے جدید - کتنی ہی چیزیں ہیں جو ایک ماحول میں جدید سمجھی جاتی ہیں اور دوسرے ماحول میں قدیم شمار ہوتی ہیں - یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جدید ہمیشہ جدید نہیں رہتا ہے ، بلکہ آج کا قدیم کل کا جدید تھا - اور آج جو جدید ہے کل قدیم ہو جائے گا -

ان گزرتے ہوئے لمحات میں ایک مسلمان کو چاہیے کہ دن گزرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر رُک کر اپنا محاسبہ کرے کہ اِس گزرے ہوئے دن میں اس نے کیا کام کیا اور کیوں کیا ؟ اور کیا کام چھوڑا اور کیوں چھوڑا ؟ محاسبۂ نفس کا یہ عمل رات سونے سے پہلے ہو تو بہتر ہے -

محاسبۂ نفس کا لمحہ دراصل ارتقائے انسانی کے لمحات میں شمار ہوتا ہے ، جبکہ انسان اپنی عقل کو خواہشوں پر اور اپنے ضمیر کو ہوائے نفس پر حاکم بنا دیتا ہے - اور مومن کا ایمان حقیقت میں ایک ایسی پولیس ہے جو اس کی نگرانی کرتی رہتی ہے ، ایک ایسا مُفتّش (جانچ کرنے والا) ہے جو ہر وقت اس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے - اور ایک حاکم ہے جو ہمہ آن خیر و شر کا فیصلہ کرتا رہتا ہے - اور اسی مضبوط ایمان کے ذریعے ایک مومن نفسِ امّارہ (بدی پر اُکسانے والا نفس) کی حالت سے نفسِ لوّامہ کی طرف ترقی کرتا ہے - اور نفسِ لوّامہ ہر گناہ کے کام پر اور نیک کام میں کوتاہی پر انسان کو لعنت ملامت کرتا رہتا ہے -

جیسا کہ ہم حدیث میں پہلے ذکر کر چکے ہیں : " عقل مند کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کرے ، اسی میں ایک وقت محاسبۂ نفس کے لیے خاص

کرے۔" اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "لوگو! اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے، اور اپنے اعمال کو تولو قبل اس کے کہ وہ خدا کی میزان میں وزن کیے جائیں۔"

حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب رات چھا جاتی تو اپنے قدموں پر دُرّہ (کوڑا) مار کر اپنے نفس سے پوچھتے کہ تم نے آج کیا عمل کیا؟

ایک جلیل القدر تابعی میمونؒ بن مہران فرماتے ہیں: ایک متقی شخص اپنے نفس کا حساب جابر بادشاہ اور لالچی شریک (ساجھے دار) سے زیادہ سخت طریقے سے کرتا ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مومن اپنے نفس پر قوّام ہے، وہ اللہ کی پکڑ کے خوف سے ہمیشہ اس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے، اور جو لوگ اپنا محاسبہ اسی دنیا میں کرتے رہتے ہیں، اُن کا حساب روزِ قیامت ہلکا ہوگا۔ اور روزِ قیامت اُن لوگوں کا حساب سخت ہوگا جنہوں نے اس دُنیا میں اپنے نفس کو بغیر محاسبے کے چھوڑے رکھا۔ پھر محاسبے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن کو ایک چیز ملتی ہے اور وہ اُسے بھلی معلوم ہوتی ہے، مگر وہ کہتا ہے: بخدا تو مجھے بھلی لگتی ہے اور تو میری ضرورت بھی ہے، لیکن میرے اور تیرے درمیان خدا کا خوف حائل ہے۔

پھر فرمایا کہ جب مومن سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے نفس کی گرفت کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تو نے اس سے کیا ارادہ کیا تھا؟ اور پھر اس کوتاہی پر نادم ہوتا ہے اور اللہ سے عہد کرتا ہے کہ ان شاء اللہ اب اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔

جو شخص روزانہ اس محاسبے کا وقت نہ نکال سکے تو وہ چند دن کے بعد یا کم از کم ہفتے میں ایک بار ضرور محاسبہ کرے تاکہ اُسے یہ معلوم ہو کہ کیا کھویا اور کیا پایا؟

پھر اسی طرح ہر مہینے کے اختتام پر محاسبے کا ایک قدرے طویل وقفہ ہونا چاہیے، اور اسی طرح جب انسان ایک سال کو الوداع کہہ رہا ہو اور ایک نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہا ہو تو اس وقت اس کو محاسبے کے لیے ایک طویل ترین وقفہ درکار ہوتا ہے تاکہ وہ اس میں اپنے گزرے ہوئے دنوں پر نظر ثانی کرے اور آنے والے دنوں کی اصلاح کا سامان کرے۔

مغربی ممالک کے لوگوں نے "سالگرہ" منانے کی ایک عجیب وغریب بدعت ایجاد کی ہے، اور افسوس کہ اس معاملے میں بعض مسلمانوں نے بھی اُن کی تقلید کی ہے۔ جب اُن کی عمر کا ایک سال گزر جاتا ہے تو وہ شان دار محفل کا اہتمام کرتے ہیں اور اس میں انواع واقسام کے لذیذ اور پُرلطف کھانے اور مشروبات پیش کیے جاتے ہیں۔

اِسی طرح لوگوں نے بعض دوسری رُسوم بھی بلا کسی شرعی دلیل کے اختیار کر لی ہیں، مثلاً عمر کے کچھ مخصوص حصّے یا کچھ مخصوص سالوں کے گزرنے پر شمع روشن کرنا اور پھر ڈرامائی انداز سے بُجھانا۔ اور اس طرح کی تقریبات میں مبارکبادیوں اور تحفوں کا لین دین کرنا۔

حالاں کہ عقل مند کے لیے بہتر یہ تھا کہ وہ اس موقع کو غنیمت جانتا اور اپنی زندگی کے ایک سال گزرنے پر غور وفکر سے کام لیتا، اور ایک ہوش مند تاجر کی طرح "جو ہر سال کے آغاز پر اپنے رجسٹروں، موجودات اور قرضوں کا جائزہ لیتا ہے" اپنی عمر کے گزرے ہوئے دنوں کا جائزہ لیتا اور یہ دیکھتا کہ اس کی عمر کا کتنا حصّہ اُس کے حق میں گزرا اور کتنا اس کے خلاف، کیا فائدہ ہوا اور کیا نقصان۔ اور پھر اس موقع پر اللہ سے دعا کرتا کہ "اُس کا حال اس کے ماضی سے بہتر ہو، اور اس کا مستقبل اس کے حال سے بہتر ہو۔"

اسی طرح دانش مند انسان کے شایانِ شان تو یہ تھا کہ وہ اپنی عمر سے ایک سال نکل جانے پر اپنے آپ کا محاسبہ کرتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے اِس کے بارے میں بازپرس کرے گا۔ اور یہ کوئی تھوڑی مدت نہیں ہے بلکہ پورا ایک سال (بارہ مہینے) ہے اور مہینہ تیس دن کا اور ایک دن چوبیس گھنٹے، ایک گھنٹہ ساٹھ منٹ اور ایک منٹ ساٹھ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔ اور زندگی کا ہر سیکنڈ اللہ کی نعمت اور انسان کے پاس اس کی امانت ہے۔

اور اس ہوش مند انسان کے لیے مناسب بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ پر غم کرتا، اِس لیے کہ اس کی عمر کا ایک سال کیا گزرا گویا اس کی عمر کی ایک بنیاد ڈھے گئی اور اس کی کتابِ زندگی کا ایک ورق پلٹ گیا۔ انسان کی زندگی کا ہر دن جو گزرتا ہے وہ دراصل اس کے شجرِ حیات کا ایک پتّا ہوتا ہے جو مُرجھا کر گر جاتا ہے۔

مستقبل کا تصوّر

ماضی کی طرح مستقبل کا تصور بھی ناگزیر ہے۔ اور انسان فطری طور پر مستقبل سے بندھا ہوا ہے، اس لیے وہ کسی صورت میں بھی نہ اس سے غفلت برت سکتا ہے اور نہ اُسے پسِ پُشت ڈال سکتا ہے۔ جس طرح انسان کو یادداشت کی قوت دی گئی ہے جو اُسے ماضی سے مربوط رکھتی ہے، اُسی طرح اُسے سوچنے کی قوت دی گئی ہے۔ جو اس کے ذہن میں مستقبل اور اُس میں متوقع چیزوں کا تصور پیدا کرتی رہتی ہے۔

مستقبل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ نظروں سے اوجھل اور نامعلوم ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لیے مستقبل کے سینے میں کیا اسرار اور خیر و شر پوشیدہ ہیں:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط۔ (لقمان: ۳۴)

ترجمہ: کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے۔

اس کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ اس میں آنے والا ہے وہ قریب ہے، آدمی چاہے جتنا بھی گمان کرلے کہ وہ دور ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ آج کے ساتھ کل لگا ہوا ہے۔ اور قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ط۔

(النحل: ۷۷)

ترجمہ: اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے، بلکہ اُس سے بھی کچھ کم۔

اس لیے عقل مند آدمی وہ ہے جو ابھی سے مستقبل کے لیے سامان کرے اور کسی معاملے کے پیش آنے سے پہلے اس کے لیے تیار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط۔

(الحشر: ۱۸)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ دین انسان کو ماضی سے وابستہ کرتا ہے، اُنھوں نے دین کے جوہر اور اس کی حقیقت کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اس لیے کہ دین کی سب سے بڑی مہم یہ ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ کی زندگی یعنی مستقبل کے لیے تیار کرے، ایک ایسے گھر کے لیے جو اِس گھر (دنیا) سے زیادہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

درحقیقت مستقبل کے تصور کو دین میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے: "بندہ دو اندیشوں کے درمیان ہے: ایک اس کی عمر کا وہ حصہ جو گزر گیا، اور وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے تعلق سے اس کے ساتھ کیا معاملہ

کرنے والا ہے ، اور دوسرا اس کی عمر کا وہ حصّہ جو باقی ہے اور اسے نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس کے تعلق سے اس کے ساتھ کیا فیصلہ کرنے والا ہے ، بندے کو چاہیے کہ اپنی دنیوی زندگی سے اپنی اُخروی زندگی کے لیے سامان کرے اور بڑھاپے سے پہلے جوانی سے خوب فائدہ اُٹھالے ، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے ، موت کے بعد اللہ کی رضاجوئی کا کوئی موقع نہیں ہے ، اور اس دنیا کے بعد جنت اور جہنم کے سوا کوئی گھر نہیں ہے ۔"

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دین دار انسان صرف اپنے اُخروی مستقبل کی فکر کرتا ہے اور دنیوی مستقبل سے بالکل غافل ہوتا ہے ، بلکہ اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ وہ آنے والے کل کے لیے پورے حزم و احتیاط سے کام لے ، اس کے لیے بھرپور تیاری کرے اور ہر وقت چوکنا رہے ۔ اور ان سارے اسباب کو اختیار کرے جو اس کے مستقبل کے لیے ممد و معاون ہوں ، خواہ ان کا تعلق دینی امور سے ہو خواہ دنیوی امور سے ۔

چوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی مومنین کے لیے بلند پایہ نمونہ ہے ، اسی لیے ہم دیکھتے کہ جب آپؐ نے اوس وخزرج کے قبیلوں کے ساتھ بیعت کی تو گویا اس کے ذریعہ آپؐ اپنی دعوت کے مستقبل کے لیے جستجو فرما رہے ہیں ۔ اور شریعتِ اسلامی اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ایک مضبوط ٹھکانے کی تلاش میں آپؐ کو ہجرت کی فکر بھی لاحق ہوتی ہے ۔ کیا بیعت عقبۂ اولیٰ اور بیعت عقبۂ ثانیہ اور یثرب (مدینہ) کی طرف آپؐ کی ہجرت کی تیاری اسلام کے مستقبل کے لیے مضبوط منصوبہ بندی اور عملِ پیہم کے علاوہ کچھ اور تھی ؟

دُنیا کے معاملے میں ہم آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھتے کہ اپنے گھر والوں کے لیے ایک سال کی خوراک ذخیرہ فرماتے ہیں ، اور اسے توکل علی اللہ کے منافی نہیں سمجھتے

ہیں ۔اس لیے کہ توکل اسباب کی فراہمی کی نفی نہیں کرتا ہے ۔

حاضر کا اہتمام

چوں کہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ ماضی سے عبرت پزیری، استفادہ اور محاسبۂ نفس کے لیے کچھ وقت نکالے، اور مستقبل پر نظر رکھنا بھی ناگزیر ہے تاکہ اس کے لیے پہلے سے سازوسامان تیار کرے اور توشہ فراہم کرے، اُسی طرح زمانۂ حاضر کے لیے بھی ایک خاص طرح کے اہتمام کی رہنمائی ضروری ہے تاکہ ہم اُس وقت سے بھرپور فائدہ اُٹھاسکیں جس میں ہم بالفعل جی رہے ہیں، قبل اس کے کہ وہ اچانک چھن جائے یا برباد ہوجائے ۔

امام احمد ابو حامد غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ :

"اوقات تین طرح کے ہیں : ایک وہ وقت جس کے بارے میں انسان کو کچھ سوچنا نہیں ہے کہ وہ کیسے گزرا، مشقت میں یا عیش وعشرت میں. اور ایک وقت آنے والا ہے جو ابھی تک آیا نہیں ہے، اور انسان نہیں جانتا ہے کہ اس کے آنے تک وہ زندہ بھی رہے گا کہ نہیں، اور اسے یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اس کے ساتھ کیا فیصلہ فرمانے والا ہے ۔ اور تیسرا وقت وہ ہے جو حاضر و موجود ہے جس میں انسان کو اپنے رب کے احکام کی پاسداری کے ساتھ بھرپور جدّ وجہد کرنی چاہیے ۔ اس طرح اگر آنے والا وقت نہ بھی مل سکا تو کم ازکم موجودہ وقت کے ضائع ہونے پر حسرت تو نہیں کرنا پڑے گا ۔ اور اگر آنے والا وقت آگیا تو اس کا حق بھی وہ اسی طرح ادا کرے گا جس طرح پہلے وقت کا کیا تھا ۔ اور انسان اپنی آرزوؤں کو پچاس سال تک دراز نہ

کرے، بلکہ جو وقت اُسے ملا ہوا ہے اُس سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھانے کا عزم کرے اور بالکل ابن الوقت بن کر اس طرح اس وقت کا استعمال کرے گویا یہ اس کی زندگی کے آخری لمحات ہیں ـــــ حالاں کہ اس کو اس کا علم نہیں ہے ۔ اور اگر اس کے لیے یہ جاننا ممکن ہو کہ جو وقت میسّر ہے یہ اس کے آخری لمحات ہیں تو اُسے چاہیے کہ اپنے آپ کو اس طرح رکھے کہ اگر اسے موت آئے تو وہ اس کو ناپسند نہ کرے ۔ اور اس کے احوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مصداق ہوں جسے ابوذرؓ نے روایت کیا ہے : "مومن صرف تین چیزوں کا آرزومند ہوتا ہے : توشۂ آخرت کی فراہمی، معاش کے لیے تگ و دَو یا حلال چیزوں سے لطف اندوزی ۔"

اور ابوذرؓ ہی سے اسی مفہوم کی ایک اور روایت بھی ہے :

"عقل مند کو چاہیے کہ اپنے وقت کے چار حصّے کرے : ایک وہ وقت جس میں اپنے رب سے مناجات میں مشغول ہو ۔ اور دوسرا وہ وقت جس میں وہ نہایت باریک بینی سے اپنا محاسبہ کرے ۔ تیسرا وہ وقت جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر غور و فکر کرے ۔ اور چوتھا وقت خورد و نوش کے لیے فارغ کرے ، اس لیے کہ یہ چیز اس کے لیے بقیہ اوقات سے استفادہ کے سلسلے میں معاون ثابت ہوگی ۔ پھر انسان کو چاہیے کہ جس وقت وہ کھانے پینے میں مشغول ہوتا ہے اس وقت کو بھی افضلِ اعمال یعنی ذکر و فکر سے خالی نہ رکھے ۔ اس لیے کہ جو کھانا وہ تناول کرتا ہے وہ بھی اللہ کی قدرت و صناعی کا عجیب و غریب نمونہ ہے ۔ اگر وہ اس میں غور و فکر کرے تو

یہ جسمانی اعمال سے بدرجہا بہتر ہوگا۔"

اور وقت حاضر کے حق کو ادا کرتے ہوئے زندگی کے لیے عمل پر اُبھارنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ شاندار یہ حدیث ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہے، جس میں آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

"جب قیامت آجائے اور اس وقت تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا ننھا پودا ہو، اور وہ اسے اپنی جگہ سے اُٹھنے سے پہلے زمین میں لگا سکتا ہے تو لگا دے۔"

اگر ہم تھوڑی دیر رُک کر اس حدیث کا تجزیہ کریں تو یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کو جس کے ہاتھ میں پودا ہے یہ حکم کیوں دیا کہ وہ اُسے لگا سکتا ہو تو لگا دے؟ حالاں کہ وہ اس پودے کا پھل چکھنے کے لیے ہرگز زندہ نہیں رہے گا۔ اس لیے اس کے پیشِ نظر یہ ہے ہی نہیں کہ آج جو پودا وہ لگا رہا ہے کل اس کا پھل توڑے گا۔

وہ اس پودے کو اس لیے بھی نہیں لگا رہا ہے کہ اس کے بعد آنے والے اس کا پھل کھائیں گے۔ اُس بوڑھے شخص کی طرح جو زیتون کا درخت لگا رہا تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ تم یہ درخت کیوں لگا رہے ہو، اب تو تم قبر کے دہانے پر کھڑے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے درخت لگایا تو ہم نے پھل کھایا، اور اب ہم درخت لگا رہے ہیں تاکہ ہمارے بعد کے لوگ پھل کھائیں۔

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس حدیث میں عمل اور عمل کرنے والے کی فضیلت بیان کی گئی ہے، چاہے کوئی اس عمل کے ثمرات سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے۔ اور اس کے ذریعے یہ بات مسلمان کے ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جب تک زندگی باقی ہے وہ زمین کی آبادکاری اور انتاج کا عمل نہ چھوڑے، اور اس کے لیے

جائز نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی بغیر عمل کے زندہ رہے خواہ اسرافیلؑ صور سنبھالے کھڑے ہوں، اور ان کے صور پھونکتے ہی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہوجانے کا یقین ہو۔

ایسے غیر یقینی لمحے میں عمل یا پودا لگانے کی تاکید دراصل موجودہ وقت کے حق کی ادائی کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور ماضی و مستقبل سے قطع نظر زندگی کے واقعی لمحوں سے استفادہ پر زور دیتی ہے:

انسان کی درازیٔ عمر کا راز

اس میں شک نہیں کہ انسان فطری طور پر زندگی سے محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو، بلکہ اس کا بس چلے تو ہمیشہ زندہ رہے۔ انسان کی اسی ہمیشگی کی خواہش کے سبب ابلیس نے آدم علیہ السلام کو بہکایا اور انھوں نے اس درخت کا پھل کھالیا جس سے انھیں منع کیا گیا تھا:

فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطَانُ قَالَ یٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْکٍ لَّا یَبْلٰی۔ (طٰہٰ: ۱۲۰)

ترجمہ: شیطان نے آدمؑ کو پھسلایا، کہنے لگا "آدم، بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے۔"

خود دینِ اسلام کی نظر میں درازیٔ عمر ایک نعمت ہے، بشرطیکہ یہ عمر نصرت حق اور عملِ خیر میں استعمال ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کون سے لوگ بہتر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ "جس کی عمر دراز ہوئی اور عمل اچھا ہوا۔"

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ موت نے لوگوں کی زندگی مکدر کردی ہے۔ بسا اوقات وہ نوجوان کو عنفوانِ شباب ہی میں اور نوبیاہتا جوڑے کو اس کی شادی

کے ابتدائی ایام ہی میں اُچک لیتی ہے ۔اور اکلوتے لڑکے کو جو خاندان کی نشانی ہوتا ہے اس کو اہلِ خاندان کے ہاتھوں سے چھین لیتی ہے ، مال دار و آسودہ حال شخص کو اُس کی نعمت و خوش حالی کے آغوش سے جھپٹ لیتی ہے ۔ اور بڑے سے بڑے رعب و دبدبے والے حاکم کو اس کے خدم وحشم کے درمیان سے اُٹھا لیتی ہے ۔اِسی لیے موت کا دوسرا نام "هَاذِمُ اللَّذَّاتِ، وَمُفَرِّقُ الْجَمَاعَاتِ" رکھا گیا ہے یعنی لذتوں کا خاتمہ کرنے والی اور جماعتوں کو منتشر کر دینے والی ۔

چونکہ موت انسانی زندگی کا انجام ہے ، اس لیے اس کی عمر بڑی مختصر ہے خواہ اس کی آرزوئیں کتنی ہی دراز ہوں اور اسے کتنی ہی لمبی مدّت جینے کو مل جائے ، مگر وہ گنے چُنے دن ہیں اور محدود انس ہے جس کے سلسلے کو موت بغیر اجازت کے کاٹ دیتی ہے ۔اور انسان کو قصۂ ماضی بنا دیتی ہے ۔

اور حدیث شریف میں ہے :

"تم جتنا چاہو زندہ رہو ، موت تمہیں آکر رہے گی ، تم جس سے چاہو محبت کرو مگر ایک دن تمہیں اس سے جدا ہونا ہے ۔ اور جو چاہو عمل کرو بلا شبہ تمہیں اس کی جزا پانی ہے اور اس کی جواب دہی کرنی ہے ۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کی عمر اس درجہ محدود ہے تو پھر کیسے وہ اپنی عمر دراز کرے گا اور کیوں کر ایسا ممکن ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت انسان کی حقیقی عمر وہ ماہ و سال نہیں ہیں جنہیں وہ پیدائش کی پہلی گھڑی سے وفات کے آخری سانس تک گزارتا ہے ۔ بلکہ اس کی حقیقی عمر تو ان افعالِ خیر اور اعمالِ صالحہ کی بقدر ہے ۔ جو اس کے نامۂ اعمال میں اللہ کے یہاں لکھے جاتے ہیں ۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تم ایک شخص کو دیکھتے ہو کہ اس کی

عمر سو سال سے زیادہ ہے مگر اس کے کھاتے میں تقویٰ اللہ (اللہ کا ڈر) اور اُس کے بندوں کو فائدہ پہنچانے کے کام کا سرمایہ صفر کے برابر ہے۔

اور ایک دوسرا انسان ہے جو جوانی ہی میں مر جاتا ہے، مگر کم مدت میں ہی اس کا نامۂ اعمال بڑے بڑے کارناموں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ایک حکیم کا قول ہے: کتنی ہی عمریں ہیں جن کی مدت وسیع ہوتی ہے مگر سامان کم ہوتا ہے اور کتنی ہی عمریں ماہ و سال کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں، لیکن سامان کے اعتبار سے زیادہ ہوتی ہیں، تو جس کی عمر میں برکت دی گئی وہ تھوڑی مدت میں اللہ تعالیٰ کے اتنے انعامات پا لیتا ہے جو نہ لفظوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں نہ اشاروں میں۔

اس لیے آدمی اللہ کی اطاعت و بندگی اور خلقِ خدا کے ساتھ بھلائی کرکے اپنی عمر دراز کر سکتا ہے۔ اور جتنا ہی اس کے عمل میں اخلاص و اتقان ہوگا، اتنا ہی اس کا اجر اور فضل اللہ کے نزدیک زیادہ ہوگا۔ اور اس کے عمل کا جس قدر فائدہ اور اثر دوسروں کی زندگیوں میں ہوگا اتنی ہی اس کی قدر و منزلت ہوگی۔ مثلاً اس نے لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائی یا اُن کو تباہی سے بچایا، یا اُن سے کوئی مصیبت دور کی، یا اُن کے کسی دشمن کو دفع کیا۔ یا وہ اعمال جن کا فائدہ افراد، جماعتوں بلکہ پوری ملت کو پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک چوٹی کے اعمال شمار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی تو اس کے لیے اُن تمام لوگوں کے برابر اجر ہوگا جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے، بغیر اس کے کہ اُن کے اجروں میں کچھ کمی کی جائے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے جنّت میں مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے سو درجے تیار کر رکھے ہیں۔ اور دو درجوں کے درمیان کا فاصلہ زمین و آسمان کے برابر ہے۔"

اسی طرح امامِ عادل اور انصاف پسند حکمراں کا درجہ بھی بڑھا ہوا ہے، کیوں کہ ان کی عدل گستری اور انصاف پسندی سے بے شمار لوگوں کو خیر پہنچتا ہے، بلکہ قومیں اور اُمّتیں ان کے عدل و انصاف سے بہرہ مند ہوتی ہیں اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ انصاف کے تقاضے پُورے کرنے کے لیے اُنھیں اپنے نفس کے ساتھ بڑا مجاہدہ، شہوانی جذبات، گناہوں کے داعیات اور ظلم کے خلاف مقاومہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی سبب سے حدیث میں آیا ہے کہ "امامِ عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک صحابیِ رسول رضؓ غزوے سے واپس ہوتے ہوئے ایک وادی سے گزرے جس میں میٹھے پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ صحابیؓ کے دل میں خیال آیا کہ کاش میں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اس وادی میں عبادت کے لیے قیام کرتا، مگر انھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لے لُوں گا ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ چنانچہ جب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، اس لیے کہ تمہارا اللہ کے راستے میں کھڑا ہونا، گھر میں تمہاری ستّر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور جنّت میں داخل فرمائے؟ اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ جس نے اللہ کے راستے میں تھوڑی دیر کے لیے بھی جنگ کی جنّت اس کے لیے واجب ہوگئی۔"

اِس طرح اعمال ایک دُوسرے سے فضیلت میں بڑھ جاتے ہیں اور اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور وہ شخص انتہائی خوش بخت ہے جو افضلِ اعمال کا حریص ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ
(الزمر : ۱۷-۱۸)

ترجمہ : (اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات غور سے سُنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔

کتنے لوگ ہیں جنہوں نے کم وقتوں میں بڑے بڑے کام کیے، یہاں تک کہ ان کے کارناموں کو کرامات تصور کیا گیا۔ حالاں کہ وہ کرامات نہیں بلکہ برکت اور توفیقِ خداوندی تھی
اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہمیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے کہ آپؐ ۲۳ سال کی قلیل مدّت میں لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ حق کی طرف لائے۔ اور آپؐ نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ پُوری انسانی تاریخ کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ اِسی قلیل مدّت میں آپؐ نے اقامت دین فرمائی، اسی کی بنیاد پر ایک بے مثال نسل کی تربیت کی۔ اور ایک مثالی اُمّت تیار کر کے عالمی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ حالاں کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی ایام ہی سے آپ کے راستے میں طرح طرح کی صعوبتیں اور رکاوٹیں حائل رہیں۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آپؐ کو اتنی ساری کامیابیاں صرف معجزاتِ الٰہی کی بدولت ملیں۔ اور آپؐ کے برابر کون ہوگا؟ ہمارا آپؐ سے کیا مقابلہ؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دعوت اور جہاد کے میدان میں اللہ تعالیٰ کی عام سنّت کے مطابق گزرتی رہی ہے۔ آپؐ کا وہ معجزہ جس کے ذریعے مشرکین کو چیلنج کیا گیا وہ دراصل قرآن تھا نہ کہ خوارقِ عادات۔ اور دوسرے معجزات بھی کسی خاص صورتِ حال میں اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کہ زمین کے ممکنہ اسباب بروئے کار لائے جا چکے ہوں اور سوائے آسمانی مدد کے اور کوئی صورت باقی نہ رہی ہو۔ جیسا کہ ہجرت کے موقعے پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر اپنی سکینت

نازل کر کے اور غیر مرئی فوج کے ذریعے آپؐ کی تائید فرمائی۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں ہر طرح کے دنیوی اسباب اختیار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار پرے باندھے فرشتوں سے آپؐ کی مدد فرمائی:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔

(الانفال: ۱۰)

ترجمہ: اور یہ بات تمہیں اللہ نے صرف اس لیے بتادی کہ تمہیں خوش خبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔

خلفائے راشدینؓ اور ان کے ساتھی صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کو دیکھو کہ انھوں نے چند دہوں کے اندر کس طرح سے دنیا کے ایک وسیع و عریض حصّے کو فتح کر لیا۔ اسلام کی نشر و اشاعت کے ذریعے اقوامِ عالم کو اسلامی تعلیمات سے اس طرح روشناس کرایا کہ ان کے جاہلی طور طریق اور عادات و زبان کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اسلام نے ایک صدی سے کم عرصے میں دنیا کے اندر جو دینی، نفسیاتی، فکری، اجتماعی اور سیاسی انقلاب برپا کیا اُسے دیکھ کر مؤرخین حیران و ششدر ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو دیکھو کہ جب اُنھوں نے خلافتِ راشدہ کو دوبارہ واپس لانے کا عزمِ مصمم کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ لوگوں کے حقوق انھیں لوٹائے جائیں، مظلوموں کی دادرسی ہو اور امانتیں اُن کے اہل کو ادا کی جائیں تو اللہ کے معاملے میں اُنھیں کسی ملامت گر کا خوف دامن گیر نہیں ہوا اور اُن کی خلافت کے ڈھائی سال بھی نہیں گزرے کہ اُنھوں نے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا۔

اور جب عملِ صالح کی راہ میں دشواریاں اور رکاوٹیں زیادہ ہوتی ہیں، اور معاونین کی قلت ہوتی ہے تو اُس کا وزن بھی اللہ کی میزان میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت اور اس کا اجر و ثواب اللہ کے نزدیک اُسی قدر دو چند ہوتا ہے۔

اسی لیے صحابۂ کرامؓ کی فضیلت اُن کے بعد کے لوگوں پر زیادہ ہے، کیونکہ وہ لوگ اس وقت ایمان لائے جب کہ لوگ حق کا انکار کر رہے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت تصدیق کی جب لوگ تکذیب کر رہے تھے۔ اسی طرح مہاجرین و انصار میں جو پہلے ایمان لانے والے صحابہ ہیں ان کا درجہ ان کے بعد کے لوگوں پر بڑھا ہوا ہے جو فتحِ مکہ اور اسلام کے غلبہ و اقتدار کے بعد ایمان لائے۔ اسی بات کو قرآن یوں واضح فرماتا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ط أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ط وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔

(الحدید: ۱۰)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اسی طرح جب حالات دگرگوں ہوں اور معاشرے میں ہر طرف بگاڑ آگیا ہو، اُس وقت بھی عملِ صالح کا اجر بڑھ جاتا ہے اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب کہ اُمراء ظلم کر رہے ہوں اور اغنیاء سرمستیاں کر رہے ہوں، طاقت ور کمزور کو ستا رہے ہوں، علماء رواداری سے کام لے رہے ہوں، بُرائی عام ہو رہی ہو، منکرات کا بول بالا ہو رہا ہو اور معروف سر چھپاتا پھر رہا ہو۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی تعبیر قدیم علماء ”ظہور الفتن اور فساد الزمان“ کے الفاظ سے

کرتے ہیں۔ اور ہم اس کی تعبیر " جدید جاہلیت " کے لفظ سے کرتے ہیں۔ لہذا اس صورتِ حال میں دین کا کام کرنے والے اور دین کے لیے کام کرنے والے گویا کہ وہ دین کی پستی اور جاہلیت کے عروج کے اِس دور میں نئے صحابہ ہیں۔

اور صحیح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"ہرج میں عبادت میری طرف ہجرت کے مانند ہے۔"

(رواہ مسلم والترمذی وابن ماجہ)

حافظ منذریؒ فرماتے ہیں کہ ہرج سے مراد اختلافات اور فتنے کا دور ہے۔ اور بعض دوسری احادیث میں اِس کی تشریح قتل سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ فتنے اور اختلافات اس کے اسباب میں سے ہیں۔ اور یہاں مسبّب کو سبب کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔

ابوامیہ الشعبانی کہتے ہیں کہ میں ابوثعلبۃ الخشنی کے پاس آیا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگ اِس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا کون سی آیت؟ میں نے کہا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ۔ (المائدہ : ۱۰۵)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی فکر کرو۔ کسی کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا، اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔

اُنھوں نے کہا کہ اِس آیت کے بارے میں مَیں نے ایک خبیر ہستی " رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا :

" تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ لوگ بخل کی اتباع کر رہے ہیں، نفسانی خواہشوں کے غلام بن گئے ہیں، دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، ہر عقل ورائے رکھنے والا شخص

اپنی ہی عقل ورائے پر نازاں ہو (یعنی کتاب وسنّت کو چھوڑ کر اپنی ہی عقل ورائے یا اپنے ہی مسلک کو اچھا اور پسندیدہ سمجھنے لگا ہو) اور جب تم ایسے خلافِ شرع کام ہوتے دیکھو جن کے روکنے کی تمہارے اندر طاقت و قوت نہ ہو تو ایسی حالت میں تم خاص طور پر اپنے نفس کی فکر کرو۔ یقیناً تمہارے بعد صبر کے ایام ہیں اور ان ایام میں صبر کرنا (اپنے دین اور کتاب و سنّت پر جمنا) انگارے کو ہاتھ میں لینے کے مانند ہوگا۔ اور جو کوئی اُن دنوں میں نیک عمل کرے گا اُس کو پچاس ویسے ہی عمل کرنے والوں کا ثواب ملے گا۔"

اِس حدیث کی روایت ابن ماجہؒ نے کی ہے اور الفاظ اُنھیں کے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے بھی اس کی روایت کی ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

بعض روایات میں اجر کے اس قدر بڑھ جانے کا سبب بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"تم لوگ خیر کے کاموں کے لیے بہت سے معاون و مددگار پاتے ہو، اور اُنھیں خیر کے کاموں کے لیے کوئی معاون نہیں ملے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اِس حدیث میں انتشارِ اسلام کے بعد کے بعض صحابہؓ سے خطاب کیا گیا ہے، جب کہ لوگ جوق در جوق اِسلام میں داخل ہو رہے تھے، اور خیر کے کاموں میں تعاون کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ورنہ وہ مہاجرین وانصار صحابہ جو دعوتِ اسلامی کے ابتدائی مرحلے میں ایمان لائے، اُن کے برابر اَجر و ثواب اور فضل و شرف میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اُنھیں اسلام پر عمل کرنے کے لیے معاونین تو کجا اسلام کے خلاف جنگ کرنے والے ہی ملے۔ اور عربوں نے ایک ساتھ ہو کر ان پر تیر برسائے۔

اِس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل برابر جاری رہنا چاہیے، جب تک سُننے والے کان اور سوچنے اور سمجھنے والے دل موجود ہوں۔ اور اس وقت تک یہ کام جاری رہے، جب تک قبولیتِ حق کی کسی بھی صورت میں ادنیٰ سی اُمید پائی جاتی ہو۔ ہاں جب قبولیتِ حق کے دروازے بند ہوجائیں اور سارے ذرائع منقطع ہوجائیں اور صورتِ حال اتنی سنگین ہوجائے کہ اس کا مقابلہ کرنا انسان کی طاقت اور اس کی برداشت سے باہر ہو تو ایسی صورت میں مومن کے لیے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

صبر کا مفہوم

یہاں صبر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ مومن جی ہار کے بیٹھ جائے بلکہ صبر یہ ہے کہ وہ فیصلۂ الٰہی کا اس طرح انتظار کرے کہ اس کا سینہ باطل کے خلاف اُبال کھا رہا ہو، جس طرح ہانڈی آگ پر اُبال کھاتی ہے۔ اور حدیثِ مذکور میں اِسی صبر کو ہاتھوں میں انگارا پکڑنے کے مانند بتایا گیا ہے۔

یہاں صبر سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مومن بگڑے ہوئے حالات کو جڑ سے بدل دینے کے لیے انتھک کوشش کرے۔ اور گہری نظر سے کام لے کر دُور رس منصوبہ بندی کرے۔ اور اس کام میں سچے اہلِ ایمان ایک دوسرے کا تعاون کرتے رہیں۔ اِس لیے کہ بسا اوقات جو کام ایک فرد نہیں کرپاتا اُسے جماعت کر ڈالتی ہے۔ کیوں کہ آدمی اپنی ذات میں کم حیثیت ہوتا ہے مگر بھائیوں کے ساتھ اس کی حیثیت بڑھ جاتی ہے، اور پھر یہ کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی بھی مدد ہوتی ہے۔ اور شاید اس سے وہی عمل مُراد ہو جس پر آدمی کو اُس جیسے پچاس آدمیوں کا اجر ملے گا، بلکہ پچاس صحابہ کے برابر اجر ملے گا۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے یہ عمل صحابۂ کرام کے اعمال کے

مانند ہے۔ جس طرح اُنہوں نے حق پر جم جانے، اسلام کی اشاعت پر متحد ہونے اور جاہلیت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا مظاہرہ کیا اور اس راہ میں جان و مال تک کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ اور اس پر پُوری ثابت قدمی سے اس وقت تک جمے رہے جب تک کہ اللہ نے کافروں کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنے دین کو غالب نہیں کر دیا۔

انسان کی دوسری عمر

جس انسان کو اعمالِ خیر میں اپنے اوقات صرف کرنے کی توفیق ملی ہے وہ اپنی عمر کو دراز کر سکتا ہے، اور وہ اپنی موت کے بعد بھی جتنا اللہ چاہے اپنی زندگی کو بڑھا سکتا ہے۔ اِس طرح وہ مُردہ ہوتے ہوئے بھی زندہ رہے گا اور قبر میں ہوتے ہوئے بھی اپنا پیغام زندوں تک پہونچاتا رہے گا۔

ایسا اس وقت ہوگا جب انسان اپنے پیچھے کوئی علمِ نافع چھوڑ جائے جس سے لوگ اُس کے بعد فائدہ اٹھاتے رہیں، یا کوئی نیک عمل یا کچھ اچھے نقوش جن کی لوگ پیروی کریں۔ یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کر جائے جو اُس کے بعد بھی لوگوں کو اپنا فیض پہنچاتا رہے، یا صالح اولاد جن کی اس نے اچھی تربیت کی ہو اور انھیں چیزوں سے انسان کی زندگی دراز ہوتی ہے اور اس کی سیرت میں عمدگی آتی ہے۔

اِسی سلسلے میں امام مسلمؒ نے ابو ہریرہؓ کے واسطے سے ایک حدیث بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، علمِ نافع یا ولد صالح جو اس کے لیے دُعا کرے۔"

ایک اور حدیث میں ان تینوں کی تفصیل آئی ہے:

" وہ اعمال وحسنات جن کا صلہ مومن کو اس کی موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے وہ یہ ہیں۔ کوئی علم (نافع) جو اس نے سکھایا اور پھیلا یا ہو، اپنے پیچھے ولدِ صالح چھوڑا ہو، ورثہ میں مصحف (قرآن) چھوڑا ہو، مسجد اور مسافر خانہ تعمیر کرایا ہو، نہر جاری کرائی ہو یا اپنے مال میں سے اپنی صحت اور زندگی کا صدقہ نکالا ہو۔ اِن اعمال کا صلہ اسے موت کے بعد بھی ملتا رہے گا۔"

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی)

اور امام مسلمؒ نے روایت کی ہے کہ " جس نے کوئی اچھی سنّت (طریقہ) قائم کی تو اس کو اس کا اجر تو ملے گا ہی اور مزید ان لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر قیامت تک عمل کریں گے۔"

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَھُمْ ط۔

(یٰسٓ : ۱۲)

ترجمہ: ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں، اور جو کچھ آثار انھوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ط۔

(القیامۃ : ۱۳)

ترجمہ: اُس روز انسان کو اُس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔

لوگوں کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ انسان جو اچھی یادیں اپنی موت کے بعد چھوڑ کر

مرتا ہے وہ اس کی دُوسری عمر ہے۔ اور یہ انسان کی محدود عمر کے بعد ایک غیر محدود عمر ہوتی ہے۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، اس لیے کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں اس کا ذکر اِن الفاظ میں موجود ہے:

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ (الشعراء: ۸۴)

ترجمہ: اور بعد کے آنے والوں میں مُجھ کو سچی ناموری عطا کر۔

اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دو آدمی مرتے ہیں اور ان کی موت کے بعد لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص اِس حال میں مرتا ہے کہ دل اس کے غم میں پھٹے پڑتے ہیں اور آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں، اور زبانوں سے اس کے لیے ذکر اور دعائے رحمت نکلتی ہے۔ اور دوسرے شخص کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ جب وہ مرتا ہے تو اُس پر نہ کوئی آنکھ روتی ہے اور نہ کوئی دِل غم گین ہوتا ہے۔ کیوں کہ اُس نے اپنی زندگی میں منفی طرزِ عمل اختیار کیا اور جب تک زندہ رہا ظلم و جبر کا بازار گرم کرتا رہا۔ ایسے ہی شخص کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

فَذَاكَ الَّذِیْ اِنْ عَاشَ لَمْ یُنْتَفَعْ بِہٖ
وَاِنْ مَاتَ لَمْ تَحْزَنْ عَلَیْہِ اَقَارِبُہٗ!

ترجمہ: پس یہی وہ شخص ہے جس کی زندگی سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچا
اور جب مرگیا تو اس کے اقرباء کی آنکھیں بھی نہیں پسیجیں۔

اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیْمٍ ۝ وَّنَعْمَۃٍ کَانُوْا فِیْھَا فٰکِھِیْنَ ۝

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ○ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ○

(الدخان : ۲۵ ـ ۲۹)

ترجمہ: کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شان دار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے، اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اُن چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین، اور ذرا سی مہلت بھی اُن کو نہ دی گئی۔

بسا اوقات یہ ظالم لوگ مرجاتے ہیں مگر اُن کے مظالم اور آثام یا اُن کے کفر و ضلال نہیں مرتے، بلکہ وہ اپنے شاگرد اور پیروکار وراثت میں چھوڑ جاتے ہیں جو تیر کی مانند ان کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہیں۔

جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جس نے اچھی سنّت قائم کی اس کو اس کا اجر ملے گا اور اس کے بعد جو لوگ قیامت تک اس پر عمل کریں گے اُن کا اجر بھی اسے ملے گا تو ٹھیک اُسی طرح جس نے کوئی بُری سنّت قائم کی ہوگی اس کا گناہ اس کے ذمّہ ہوگا اور جو لوگ اس پر قیامت تک عمل کریں گے اُن کا گناہ بھی اُس کے ذمّہ ہوگا۔

اور جس طرح کسی شخص نے علم نافع چھوڑا تو اس کے عمل صالح کا سلسلہ منقطع نہیں ہوگا۔ اُسی طرح اگر کسی شخص نے بُرے نقوش اور گمراہ کن افکار چھوڑے تو ان کی بداعمالیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہے گا۔

کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ۔ جو خود تو مٹی میں چلے گئے۔ مگر اُن کے گناہ پر اکسانے والے اعمال، ان کے باطل اقوال یا اُن کے گمراہ کن افکار ہمیشہ کتابوں، مقالات،

فلموں اور ڈراموں یا کیسٹوں اور ریکارڈروں کی شکل میں اُن کی نمائندگی کرتے رہیں گے۔ اِس طرح اُن کے ذریعے لوگوں کے دِل و دماغ بگاڑنے کا کام جاری رہے گا۔

اِسی لیے بعض صالحین کا قول ہے کہ خوش بخت ہے وہ شخص جس کے مرنے کے بعد اس کے گناہ بھی مر جائیں۔ اور بدبخت ہے وہ شخص جس کے گناہ اس کے مرنے کے بعد باقی رہیں۔

وقت کو برباد کردینے والی آفات سے آگاہی

اِس میں شک نہیں کہ بہت سی ایسی آفات ہیں جو انسان کے وقت کو برباد کر دیتی ہیں اور اس کی عمر کو کھا جاتی ہیں۔ بالخصوص اس وقت جب وہ ان کی سنگینی سے واقف نہیں ہوتا ہے۔ وہ آفات یہ ہیں :-

۱۔ غفلت

یہ ایک ایسا مرض ہے جو انسان کے دل و دماغ کو اس طرح لگ جاتا ہے کہ وہ دُنیا میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات اور شب و روز کی آمد و رفت کے سلسلے میں بیدار حسی کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور مختلف اشیاء کے حقائق اور معاملات کے عواقب سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے اس کی توجہ کا مرکز صورت ہوتی ہے نہ کہ رُوح، اور اس کی نظر حقائق کو چھوڑ کر ظواہر پر، مغز کو چھوڑ کر چھلکوں پر اور انجام و عواقب کو چھوڑ کر آغاز پر ہوتی ہے۔

غفلت کے مرض کی اسی سنگینی کے سبب قرآنِ کریم نے جگہ جگہ پُوری شدّت کے ساتھ اِس سے آگاہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ غافلین کو جہنّم کا ایندھن قرار دیا ہے اور اُنھیں بے زبان جانوروں سے زیادہ گمراہ گردانا ہے :

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

(الاعراف : ۱۷۹)

ترجمہ: اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں، جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سُنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوگئے ہیں۔

قرآن ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو حقیقت اور مغز کو چھوڑ کر ظاہری علم کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور ان کے سلسلے میں کہتا ہے:

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۔ (الروم : ۷-۶)

ترجمہ: اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔

اپنے رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخاطب کرکے کہتا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

(الاعراف : ۲۰۵)

ترجمہ: اے نبیؐ، اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور

خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم اُن لوگوں میں نہ ہوجاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور ایک دوسری آیت میں اِن الفاظ میں مخاطب کیا ہے:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف: ۲۸)

ترجمہ: کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور جس نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی اختیار کرلی ہے۔ اور جس کا طریقۂ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

یقیناً غفلت ایک بڑی مصیبت ہے۔ اِسی غفلت ہی کے نتیجے میں آج اُمّتِ مسلمہ کا حال یہ ہوگیا ہے کہ اس پر ایسے بڑے بڑے خوفناک حادثات گزر رہے ہیں جو پہاڑوں کو متزلزل کردیں، مگر ہماری اُمّت کی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ نہ تو وہ اُن سے کوئی سبق لیتی ہے اور نہ اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرتی ہے، بلکہ اس کی غفلت اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ اِن حوادث کی اس طرح عادی ہوگئی ہے گویا کہ یہ سب کچھ ایک ڈراما ہے یا کسی ڈرامے کا سین ہے۔

اِسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دُعا فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تَدَعْنَا فِيْ غَمْرَةٍ، وَلَا تَاْخُذْنَا عَلٰى غِرَّةٍ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْغَافِلِيْنَ۔"

ترجمہ: "اے اللہ ہمیں سختی میں نہ چھوڑ اور ہمیں غفلت کی حالت میں نہ پکڑ اور ہمیں غافلوں میں سے نہ بنا۔"

اور سہل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے

پرہیز کرو : رواداد علماء، جاہل صوفیاء، اور سرکش ظالم !

۲۔ ٹال مٹول کی عادت

ٹال مٹول کی عادت انسان کے اوقات کو برباد کر دینے والی انتہائی خطرناک آفت ہے۔ اور یہ عادت کبھی انسان کو اپنے اوقات سے فائدہ اُٹھانے نہیں دیتی ہے بلکہ وہ اس حد تک اپنے کاموں کو ٹالنے کا عادی ہو جاتا ہے کہ لفظِ "کل" اس کا شعار اور اس کے معاملات کا مزاج بن جاتا ہے۔ اور نتیجتاً ایسا انسان بالکل نکما اور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

قبیلۂ عبدالقیس کے ایک آدمی سے کہا گیا کہ ہمیں وصیت کرو تو اس نے کہا : "ٹال مٹول کی عادت سے ہوشیار رہو۔"

اور ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے کہ "ٹال مٹول کی عادت" ابلیس کی فوج کا ایک سپاہی ہے۔

اس لیے تمہارا فرض یہ بنتا ہے کہ اپنے وقت کا بھرپور استعمال کرو۔ اور آج تمہیں جو وقت ملا ہوا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ علم نافع حاصل کرو اور عملِ صالح کرو۔ اور کسی کام کو آنے والے کل پر مت ٹالو، ورنہ فی الحال تمہیں جو وقت ملا ہوا ہے وہ تباہ و برباد ہو جائے گا اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ اس لیے تم کو آج کے دن میں بونا چاہیے تاکہ آنے والے کل میں فصل کاٹ سکو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے حصے میں حسرت و ندامت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں : ٹال مٹول سے بچو، اس لیے کہ تمہارا تعلق آج سے ہے نہ کہ آنے والے کل سے، اور اگر وہ "کل"، تمہیں مل بھی جائے تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو تم نے "آج" کے ساتھ کیا تھا۔ اور اگر "کل" تمہارا نہ ہوا تو تم کو آج کی

کوتاہیوں پر پچھتانا پڑے گا۔

اِس بُری عادت کی آفات

ٹال مٹول اور آج کی ذمہ داری کل پر ٹالنے میں بہت سی آفتیں ہیں:

۱۔ تم اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کل تک تم زندہ رہو گے۔

کسی والیِ شہر نے ایک مردِ صالح کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تو انھوں نے معذرت کرلی اور کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ امیر نے کہا: آج روزہ توڑ دیں، کل رکھ لیں۔ اس پر مردِ صالح نے کہا: کیا تم اس بات کی ضمانت دیتے ہو کہ میں کل تک زندہ رہوں گا؟

اور کون کسی کے لیے اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ وہ کل تک زندہ رہے گا؟ در آں حالیکہ موت اچانک آتی ہے، اور اس کے آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔

حادثے کی موت ہمارے زمانے میں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ باوجودیکہ اِس دور میں طب اور سائنس نے کافی ترقی کرلی ہے مگر طب سکتہ اور خُناق وغیرہ کے سبب واقع ہونے والی اموات پر قابو پانے میں ناکام ہے، اسی طرح سائنس اُن اموات کو روکنے میں ناکام ہے جو تہذیبِ جدید کے مختلف آلات (موٹر گاڑیوں، ہوائی جہاز اور بجلی کے آلات وغیرہ) کے ذریعے روزانہ رونما ہونے والے حادثات کے نتیجے میں واقع ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ سائنس ہی نے موت کے یہ اسباب فراہم کیے ہیں۔ کیوں کہ اس دورِ صنعت سے پہلے انسان اِن حادثوں سے مامون تھا۔

۲۔ اگر تمہیں کل تک کی زندگی کی ضمانت مل بھی گئی تو تم ان بہت سی رکاوٹوں

سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو اچانک مرض، ہنگامی مشغولیت اور ناگہانی مصیبت کی شکل میں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم خیر اور بھلائی کے کاموں اور ذمّے داریوں کی ادائی میں جلدی کرو۔ اور یہ بدترین حماقت ہے کہ تم کام کو مسلسل ٹالتے رہو یہاں تک کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور تمہارے پاس کفِ افسوس ملنے اور شکوہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: زندگی کو موت سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور مال داری کو محتاجی سے پہلے۔"

ایک عمر رسیدہ عالم نے بعض نوجوانوں سے کہا: کام کرو اس دن کے آنے سے پہلے جب تم چاہنے کے باوجود کام نہ کر سکو گے۔ اور میں آج کام کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں کر سکتا ہوں۔

اور حفصہ بنت سیرین کہتی ہیں: اے نوجوانو! کام کرو، اور کام تو دراصل جوانی ہی میں ہوتا ہے۔

۳- ہر روز کا اپنا کام ہے اور ہر وقت کی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہے جو خالی آتا ہو اور اپنے ساتھ نئی ذمے داریاں نہ لاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے جسم پر کثرتِ عمل کے باعث تھکان کے آثار دیکھ کر اُن سے عرض کیا کہ اس کام کو کل پر ٹال دیں تو خلیفۂ وقت نے فرمایا: ایک دن کے کام نے تو مجھے تھکا کے رکھ دیا ہے۔ اور جب دو دن کا کام جمع ہو جائے گا تب میرا کیا حال ہو گا۔

اور ابنِ عطاءؒ نے فرمایا:

اوقات کے اندر حقوق کو تو ادا کیا جا سکتا ہے مگر اوقات کے حقوق کو ادا کرنا ممکن نہیں ۔ جو وقت بھی آتا ہے تم پر اللہ کا ایک نیا حق واجب کرتا ہے، اور ایک طے شدہ امر کے ساتھ آتا ہے ۔ اگر تم نے اس وقت میں اللہ کا حق ادا نہیں کیا تو دوسروں کا حق کیسے ادا کرو گے ؟

۴ ۔ بلا شبہ اطاعت میں تاخیر اور خیر کے کاموں میں ٹال مٹول کے سبب نفسِ انسانی ان اعمال کو ترک کرنے کا عادی ہو جاتا ہے ۔ اور یہی عادت جب انسان کے اندر اپنی جڑیں جما لیتی ہے تو پھر اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے جس سے چھٹکارا پانا بہت دشوار ہوتا ہے ۔ اور معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ آدمی عقلی طور پر اس بات کا قائل تو ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت اور عملِ صالح میں جلدی کرنا ضروری ہے مگر وہ اپنے عزم اور ارادے میں اتنی پختگی نہیں پاتا جو ان اعمال کے کرنے میں اس کے ممد و معاون ثابت ہوں بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے اندرون میں ایک طرح کا بوجھ اور عمل سے اعراض کی کیفیت محسوس کرتا ہے ۔ اور اگر کسی روز خیر کے کام کے لیے ایک آدھ قدم چل لیتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی پیٹھ پر پہاڑ لدا ہوا ہے ۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اسی طرح کی ٹال مٹول گناہوں اور نافرمانیوں سے توبہ کے سلسلے میں بھی کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس معاصی کے ارتکاب اور شہوت رانی کا عادی ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ گناہوں کا چھوڑنا اُس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ روز بروز گناہوں سے اس کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ اس طرح گناہ کا حجم بڑھتا رہتا ہے اور دل پر اس کا اثر وسیع ہو جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ اس کی سیاہی دل پر چھا جاتی ہے اور اس کی تاریکی پُورے دل کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے کہ نورِ ہدایت کی رسائی انسان کے دل تک ناممکن ہو جاتی ہے ۔

حدیث میں ہے :

"مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک کالا نقطہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے اور اگر وہ اُس گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور اس سے باز آجاتا ہے اور استغفار کرتا ہے تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ شخص گناہ میں بڑھتا رہے تو سیاہ نقطوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل اُن کی سیاہی سے ڈھک جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔

(المطففین: ۱۴)

ترجمہ: ہرگز نہیں، بلکہ دراصل اِن لوگوں کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

۵۔ عمل کا انسان سے گہرا ربط ہے بلکہ عمل ہی اُس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اور جو آدمی عمل نہیں کرتا ہے اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور کام کا مطالبہ انسان سے اُس وقت تک ہے جب تک کہ اس کی نبض حرکت کر رہی ہے خواہ وہ کام دینی ہو یا دنیوی۔

یہ حکیمانہ قول بہت مشہور ہے کہ: اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرو گویا کہ تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور اپنی آخرت کے لیے اس طرح کام کرو گویا کہ کل تمہیں مرنا ہے۔

زمانے کو بُرا بھلا کہنا

زمانے پر لعن طعن کرنا اور ہمیشہ اس کے ظلم و ستم اور گردشِ ایام کا شکوہ کرنا عمل کی راہ کی اُن آفات اور رُکاوٹوں میں سے ہے جن سے چوکنا رہنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ زمانے کو ایک ایسا مخالف تصور کرتے ہیں جو اُن پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے یا ایسا دشمن جو ہمیشہ اُن کے چکّر میں پڑا رہتا ہے۔ یا اُسے ایسا ظالم

حکمراں تصور کرتے ہیں جو بے گناہوں کو سزا دیتا ہے اور گنہگار کو جری بناتا ہے، اور فلاں کے خلاف فلاں کی پیچ کرتا ہے۔ ان کے خیال میں زمانہ یہ سارے کام بغیر کسی سبب کے صرف خواہشوں کی پیروی میں کرتا ہے۔ اور اُس کے سارے تصرفات بے سوچے سمجھے ہوتے ہیں، اِسی لیے کبھی درست اور اکثر غلط ہوتے ہیں۔

اور یہ ساری باتیں دراصل تصورِ جبریّت کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے کہ اس تصوّر کے قائل افراد اور معاشرے اِس کی آڑ میں اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے بَری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے اعمال اور غلطیوں کی جواب دہی سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے گناہ کا بوجھ آپس میں ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں یا زمانہ اور قضا و قدر کو اپنے گناہوں کا ذمّہ دار قرار دیتے ہیں۔

حالاں کہ اِن کی ذمّہ داری یہ تھی کہ جب کوئی مصیبت اِن پر آتی، یا کوئی نعمت اِن سے چھنتی تو اُس پر وہ غور و فکر سے کام لیتے اور سطحیت سے بلند ہو کر گہری نظر سے اس کا تجزیہ کرتے اور اسباب و مسبّبات میں ربط پیدا کر کے اس کائنات میں جاری خدائی سُنّتوں کے مطابق نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے۔ اور زمانے کی حیثیت اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ وہ ان حوادث کی آماجگاہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی سنّت کے مطابق گردش دیتا رہتا ہے۔ اور اس صحیح حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے۔ " زمانے کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ اللہ کی ذات ہی زمانہ ہے۔" (رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ)

چنانچہ غزوۂ اُحد میں جب مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیّت کے باوجود شکست و ریخت سے دوچار ہوئے اور اُس میں ستّر جانباز صحابہ شہید ہو گئے تو لوگ آپس میں اس مصیبت اور زخم خوردگی کا سبب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے تو اس وقت ان کو جو قرآنی جواب ملا وہ یہ ہے:

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۔ قُلْتُمْ

أَنّٰى هٰذَا ط قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران : ۱۶۵)

ترجمہ: اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالاں کہ (جنگِ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبیؐ، ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن اپنے ان الفاظ میں ایک عام قاعدہ مقرر کرتا ہے:

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

(الانفال : ۵۳)

ترجمہ: یہ اللہ کی اُس سنّت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔

اِس لیے مومن کو چاہیے کہ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس کا سبب اپنے اندر تلاش کرے اور پھر اپنے رب کی طرف رجوع ہو کر توبہ و استغفار کے ساتھ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اپنی زبان سے وہ کہے جو آدم و حوا علیہما السلام نے کہا تھا:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا۔ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (الاعراف : ۲۳)

ترجمہ: اے رب! ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔

اور وہ کلمات کہے جو موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کہا جب وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرکے اپنی قوم کے پاس لوٹے اور دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئی ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۔ (الاعراف : ۱۵۱)

ترجمہ: اے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔

اور اُن خدا پرستوں کا قول بھی اپنی زبان سے دہرائیے جو اُنھوں نے اس وقت کہے جب اُن کے کچھ ساتھی راہِ حق میں شہید ہو گئے:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۔ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

(آل عمران : ۱۴۷ ـ ۱۴۸)

ترجمہ: اُن کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارا کام تیری حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"، آخر کار اللہ نے اُن کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔
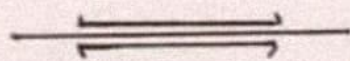
ڈاکٹر یوسف القرضاوی (پ:۱۹۲۶) دنیائے اسلام کے ذہین ودراک مصنف اور علم فقہ کے مجتہد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

موصوف اپنے وطن مصر میں پیدا ہوئے، دس سال کی عمر میں حفظ قرآن حکیم کیا، ۱۹۵۳ء میں جامعہ ازہر سے "اصول الدین" میں عالمیت کی سند حاصل کی، ۱۹۸۵ء میں عربی زبان وادب کا ڈپلومہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ ازہر کے "کلیۃ اصول الدین" سے اجتماعی مسائل کے حل میں زکوٰۃ کے اثرات" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر قرضاوی قطر یونیورسٹی کے شریعت کالج اور اسلامک اسٹڈیز کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اس وقت اسی یونیورسٹی میں مرکز تحقیقات سنّت وسیرت نبوی ﷺ کے بانی ڈائریکٹر اور اسلامک بنکوں کے علمی فیڈریشن کی مجلس اعلیٰ کے رکن ہیں۔

موصوف نے اسلامی تحقیقات کے مختلف پہلوؤں پر تیس سے زائد کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں بیشتر کے ترجمے مختلف عالمی زبانوں میں ہو چکے ہیں — ان کی مشہور کتاب "فقہ الزکوٰۃ" ہے۔ جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے "فقہ اسلامی کی اس صدی کی کتاب" قرار دیا ہے۔ "الحلال والحرام" بھی مشہور کتاب ہے۔

زیر نظر کتاب "وقت کی اہمیت" ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی معرکہ آرا کتاب "الوقت فی حیاۃ المسلم" کا سلیس اور رواں اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی میں وقت کی کیا قدر وقیمت ہونی چاہیے — اور وہ اسے کس طرح استعمال کر کے دونوں جہاں کی فلاح وکامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

مترجم کتاب جناب مولانا عبدالحلیم فلاحی ۱۹۵۴ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں 'کو ہنڈا' میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی — ۱۹۷۵ء میں جامع الفلاح سے سندِ فضیلت حاصل کی، ۱۹۷۷ء میں ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند علی گڑھ سے بہ غرض تربیت تصنیف وتالیف وابستہ ہو گئے، ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۳ء تک اشاعت اسلام ٹرسٹ دہلی سے وابستہ رہے — اب بہ غرضِ ملازمت دوحہ (قطر) میں مقیم ہیں۔

₹50.00